ماھنامہ

حکمت بالغہ

دسمبر2008

مدیر: انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اورفیکس:0092-47-7628361

ای میل:hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ www.hamditabligh.net پر حکمت بالغہ کے تمام شمارے دستیاب ہیں

حرف آرزو

انجینئر مختار فاروقی

ماہ دسمبر 08ء کا شمارہ ہدیۂ قارئین ہے اس شمارے کے ساتھ ہی ''حکمت بالغہ'' کی ''عمر'' دو برس کی ہو جائے گی۔ جرائد کی دنیا میں دو سال کی ''عمر'' کوئی قابل ذکر عرصہ نہیں ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے جتنی پذیرائی اور GOOD WILL اتنے مختصر عرصے میں ہمیں عطا فرمائی ہے وہ صرف اسی (ذات باری تعالیٰ سبحانہ) کی عطا ہے۔ اس عرصے کے دوران ''حکمت بالغہ'' کو یہ اعزاز بھی ملا ہے کہ خالص علمی سطح پر ''**حقیقت انسان نمبر**'' دسمبر 07ء اور ''**حقیقت علم نمبر**'' اگست 08ء دو معیاری نمبر شائع ہوئے ہیں جنہوں نے اہل علم و دانش سے بھرپور خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔

''**حقیقت علم نمبر**'' میں درج مغربی علوم کی گمراہیوں کے نتیجے میں 'پس چہ باید کرد' کے عنوان سے آج کے مغربی علوم کی بے راہ روی کی اصل وجہ خدا بیزاری اور خدا ناشناسی ہے۔ اور علامہ اقبال، مولانا مودودی، ڈاکٹر رفیع الدین اور دیگر اکابرین امت کے نزدیک مسلمانوں کے مسائل کا حل بالخصوص اور عالم انسانی کی فلاح بالعموم اسی میں ہے کہ ان مغربی علوم کو ''مسلمان'' کیا جائے اور ان علوم میں ''خدا'' کی واحدنیت، ربوبیت اور الوہیت کا تصور سمو دیا جائے تاکہ ہر فرد نوع بشر جب تعلیمی سرگرمیوں سے فراغت حاصل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھے تو وہ نہ صرف معاش کمانے کے قابل ہو بلکہ ایک صحیح راسخ العقیدہ مسلمان ہو بلکہ عقلی و منطقی طور پر یکسو اور مطمئن انسان جس کا ذکر قرآن مجید میں ''وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ'' (لیکن میرا دل مطمئن ہو جائے) کے الفاظ مبارکہ سے آیا ہے۔

اس کام کو تاریخی تسلسل میں ''احیاء العلوم'' کا نام دینا مناسب ہوگا۔ اور یہ خواہش تھی علامہ اقبال کی اور ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی جو ساری زندگی اس کے لئے کوشاں رہے اور اسلامی تعلیم کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیے رکھا۔

زندگی رہی تو ان شاء اللہ حسب وعدہ اوائل 2009 میں ''حکمت بالغہ'' کا احیاء العلوم نمبر شائع ہوگا۔

اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ

قرآن شریف میں پوشیدہ حقائق

قرآن پاک میں جو الفاظ جتنی بار آئے ہیں، ان کی تعداد آگے درج ہیں۔

دنیا (زندگی کا ایک نام)	115	آخرت	115
ملائکہ (فرشتے)	88	شیطان	88
زندگی	145	موت	145
احسان	50	گمراہی	50
قوم (لوگ)	50	پیغمبر	50
ابلیس	11	ابلیس سے پناہ مانگو	11
مصیبت	75	شکر	75
صدقہ	73	اطمینان (تسلی)	73
گمراہ لوگ	17	مردہ لوگ	17
مسلمان	41	جہاد	41
سونا	8	پرآسائش زندگی	8
جادو	60	فتنہ	60
زکوٰۃ	32	برکت	32
عقل	49	نور (روشنی)	49
زبان	25	خطبہ	25
خواہش	8	خوف	8
تبلیغ	18	اشاعت	18
سختی	114	صبر	114
حضرت محمد ﷺ	4	سیرت نبوی ﷺ	4
مرد	24	عورت	24

اب مندرجہ ذیل الفاظ سے متعلق آنکھیں کھول دینے والے قرآن پاک کے عددی

حقائق پڑھیں:

نماز(اوقات)	5	ماہ	12
دن	365	سمندر	32
خشکی	13		

اگر سمندر اور خشکی کو جمع کریں تو جواب یہ آئے گا۔45=32+13اب ریاضی کے درج ذیل حل دیکھئے: %سمندر= 71.1111111=100%*32/45

%خشکی= 28.88888889=100%*13/45

جدید سائنس کے ذریعے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زمین کے 71.111 فیصد حصے پر پانی ہے جبکہ 28.889 فیصد حصے پر خشکی ہے۔قرآن پاک اور جدید سائنس کے ایک جیسے نتائج کیا اتفاقی حادثہ ہیں؟ یہ حقائق کس ہستی نے رسول اللہ ﷺ کو بتلائے تھے؟ جی ہاں! مالک کائنات نے آپ کو کائنات کے ان رازوں سے کئی صدیاں پہلے آگاہ کر دیا تھا۔

ماخوذ از قرآن کریم ترجمہ: فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ

ناشر: قرآن سوسائٹی پاکستان جلال پور جٹاں (گجرات)

قرآن پاک اور سائنس

انجینئر سلطان بشیر محمود
(سابق ڈائریکٹر جنرل پاکستان اٹامک انرجی)

موجودہ سائنسی دور میں ہر چیز کی سچائی کا معیار سائنس کو سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ مذہب کی سچائی کو بھی بعض لوگ سائنس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔ انیسویں صدی میں جب مغربی دنیا میں سائنسی علوم نئے نئے متعارف ہوئے، تو وہاں بھی ATHEISM کی ایک لہر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جس کا نظریہ یہ تھا کہ جو چیز تجربہ سے ٹیسٹ نہیں ہوسکتی یا حساب سے ثابت نہیں ہوسکتی وہ باطل ہے۔ اب مذہبی نظریات اور روحانی تجربات نہ تو حساب کے دائرہ کار میں آتے ہیں نہ ہی کسی لیبارٹری میں قابل تجزیہ ہیں۔ چنانچہ سائنس سے مرعوب بے شمار لوگوں نے مذہب کو محض ڈھکوسلا (MYTH) قرار دیتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے وجود سے بھی انکار کر دیا۔ لیکن جوں جوں یہ ثابت ہونے لگا کہ سائنس بھی کوئی حتمی علم نہیں بلکہ یہ بھی بے شمار غیر ثابت شدہ مفروضوں پر قائم ہے تو بیسویں صدی کے شروع میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات مبارک سے روگردانی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس میں اب کسی قدر کمی آنے لگی ہے لیکن سائنس نے آزادی رائے، تحقیق اور تنقید کے حق میں جو فضا پیدا کی تھی مذہب اس کی زد سے بچ نہ سکے۔ چنانچہ مغربی سکالرز نے جب عیسائی اور یہودی مذہبی کتابوں یعنی موجودہ انجیل اور تورات کا سائنسی انداز میں تجزیہ کیا تو ان میں بے شمار غلطیاں اور بنیادی قدرتی اصولوں کے خلاف نظریات پائے گئے جس کا یہ مطلب لیا گیا کہ یہ کتابیں خالق کائنات سے نہیں ہوسکتیں بلکہ اپنے وقت کے انسانوں کی تخلیق ہیں۔ چرچ کے لئے

یہ ایک بہت دھچکا تھا۔ ایسے میں اپنے سنبھالے کے لئے عیسائی چرچ نے نئی سوچ نکالی کہ جہاں

تک سائنسی اصولوں اور مادی حقائق کا تعلق ہے یہ اسی زمانہ کے مطابق تھے جب یہ کتابیں لکھی گئی تھیں۔لیکن ان کے اخلاقی ضابطے اٹل ہیں۔اس لئے اخلاقی اور مذہبی طور پر انجیل اور تورات وغیرہ پر اعتبار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ توضیح لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔لہٰذا جدید سائنسی افکار کے زیر اثر عیسائی دنیا کی اکثریت مذہبی طور پر اب عیسائی نہیں رہی اور عیسائیت کی جگہ مغربی تہذیب نے لے لی ہے جس کی بنیاد SECULARIMS یعنی لادینیت ہے۔ افسوس کی یہ بات ہے کہ جیسے کبھی عیسائیت کو پھیلانے کے لئے وہ کوشاں (CRUSADE WARS) تھے اب اہل مغرب ،مغربی تہذیب کو بے دینی کے مذہبی جنون سے بقیہ دنیا پر نافذ کرنے لئے تلے ہوئے ہیں۔

اسلامی دانشور اور سائنسی حقائق

اسلامی دنیا کے دانشور (INTELLECTUAL) کا بھی جدید سائنس سے متاثر ہونا فطری عمل ہے۔ان میں اب دو گروپ بن گئے ہیں۔CONSERVATIVE گروپ جس میں زیادہ تر پرانی طرز کے علماء ہیں وہ تو سائنس کے خلاف کھلی نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور قرآن حکیم کے متعلق ہر قسم کے سائنسی تجزیہ کی کھلی مخالفت کرتے ہیں۔اس گروپ کی قابل ذکر شخصیت سعودی عرب کے ایک بہت بڑے عالم الشیخ بن باز صاحب کی تھی جنہوں نے ، جب انسان کے چاند پر پہنچنے کا اعلان ہوا تو اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ فتویٰ دیا کہ اس کا اقرار کفر ہے۔

وہ علماء جو سائنسی حقائق کو مذہب سے دور رکھنا چاہتے ہیں ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن حکیم کی حقانیت اپنی جگہ مسلمہ ہے،اس کے لئے کسی سائنسی شہادت کی ضرورت نہیں۔لہٰذا ان کے نزدیک ''قرآن پاک اور سائنس'' کا موضوع نہ صرف یہ کہ فضول بات ہے بلکہ ایک خطرناک بدعت ہے جس میں مسلمانوں کو ہرگز نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ تقریباً وہی بات ہے جو سترھویں صدی کے عیسائی پادریوں کا مؤقف تھا۔مثلاً جب پہلی دفعہ سائنس دانوں نے کہا کہ زمین اپنی تخلیق میں اربوں سال پرانی ہے تو انگلینڈ کے لارڈ بشپ نے نہ صرف اس نظریہ کی پرزور مذمت کی بلکہ یہ بھی بتایا کہ زمین کی عمر صرف چھ ہزار سال ہے۔اس سے پہلے جب گلیلیو نے کہا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو چرچ نے اسے سزائے موت سنا دی لیکن زندگی کی بھیک کی خاطر بیچارے گلیلیو نے

معافی نامہ لکھ کر دیا اور اپنے نظریات سے توبہ کی۔ لیکن بالآخر سائنس جیت گئی چرچ کی یہ ہار عیسائیت کی ہار ثابت ہوئی جس کا نتیجہ آج کل کی مغربی لادینیت کی شکل میں ساری دنیا بھگت رہی ہے اب یہ ٹکر اسلامی دنیا میں شروع ہوئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جدید ذہن کو پرانی سوچ کے اسلامی علماء کیسے مطمئن کرتے ہیں۔

ان بزرگوں کے برعکس ایک دوسرا گروپ ان دانشوروں کا ہے جو اس مفروضہ پر کام کر رہا ہے کہ جلد ہی مسلمانوں کو سائنسی طرف سے قرآن حکیم کے بارے وہی چیلنج پیش آئے گا جو انیسویں بیسویں صدی میں انجیل اور تورات کو پیش آیا تھا۔ لہٰذا لادین (SECULAR) دانشور نقادوں کا انتظار کئے بغیر اسلام کے یہ علماء از خود قرآن حکیم پر سائنسی کام کر رہے ہیں اور دنیا پر قرآن پاک کی سائنسی عظمت واضح کر رہے ہیں ان کے نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن حکیم، انجیل کی طرح انسانی تخلیق نہیں بلکہ یہ ہو بہو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس لئے اس میں کوئی حقیقی سائنسی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا مسلمانوں کو سائنس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ قرآن پاک جھوٹا ثابت ہو جائے گا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر سائنس کا کوئی مفروضہ قرآن حکیم سے ٹکراتا ہے تو وہاں سائنس غلطی پر ہوگی۔ ان کا خیال ہے کہ سائنس اور قرآن پاک کے درمیان موافقت دیکھ کر مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ کے عقل سلیم رکھنے والے دانشوروں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس لئے ان کے نزدیک فی زمانہ قرآن پاک پر سائنس کے حوالہ سے ریسرچ اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔

وقت کی اہم ضرورت

دیکھا جائے تو دونوں قسم کے اسلامی دانشور اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی مسلمان کیلئے قرآن حکیم کی حقانیت پر ایمان کیلئے کسی سائنسی یا غیر سائنسی شہادت کی ضرورت نہیں لیکن قرآن پاک بذات خود یہ چاہتا ہے کہ اس کی آیات پر خوب غور و فکر کیا جائے بلکہ تقریباً ایک چوتھائی کلام پاک تو انسان کو صحیفہ فطرت پر غور کی ہی دعوت ہے۔ ایسی فکر کا ہی دوسرا نام سائنس ہے لہٰذا قرآن حکیم میں سائنسی غور و فکر اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور ایک زبردست عبادت ہونا چاہئے۔ لیکن اس کام میں کم علمی یا بے صبری خطرناک ہو سکتی ہے اس لئے یہ کام ایسے

لوگوں کو کرنا چاہئے جو ایک خاص علمی مرتبہ رکھتے ہوں قرآن حکیم انہیں اولی الالباب کا اعلیٰ خطاب دیتا ہے یہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے، صحیفہ قدرت میں خوب غور کرنے والے سمجھدار، حقیقت پسند مسلمان ہیں جو کسی دوسری ازم یا سائنس سے مرعوب نہیں، لیکن وہ متعصب بھی نہیں ہیں۔

اسلامی دنیا میں ایسے لوگوں کی بڑی کمی ہے اس خلاء کو پورا کرنے کے لئے کچھ ایسے بھی لوگ سامنے آئے ہیں جو بڑے پر جوش ہیں لیکن ان کی قرآنی واقفیت اور سائنسی علم سطحی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کے جوشیلے کم علم اور کم فہم لوگ اس نازک اور حساس موضوع کی کوئی صحیح خدمت نہیں کر سکتے بلکہ الٹا بہت سی غلط فہمیوں کا باعث بن رہے ہیں۔ ان کی اسلام سے محبت اپنی جگہ قابل قدر ہے لیکن مشورہ یہی ہے کہ وہ قرآن پاک اور سائنس دونوں کو اس وقت تک معاف رکھیں جب تک وہ علم کی پختگی کو نہیں پہنچتے۔

اس قبیلہ کے کچھ لوگوں کو نئی نئی تھیوریاں نکالنے کا بھی شوق ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی غلط تاویلات سے وہ بعض اوقات نئی دریافتوں کے دعوئے بھی کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے حال ہی میں اپنی کتاب ''قرآن اور سائنس'' میں شمسی نظام کے بارہویں سیارے کی دریافت کا اعلان کیا ہے بلکہ یہ کہہ دیا ہے کہ عرش بریں اسی سیارہ پر ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کے مطابق اللہ تعالیٰ عرش بریں پر ضرور استویٰ ہے لیکن اس کی کرسی کی وسعت بھی تمام آسمانوں اور زمین سے زیادہ ہے۔ اس لئے عرش معلیٰ اور کرسی کو کائنات کی حدود میں لانا ایک فحش غلطی ہوگی۔ ایک اور صاحب جن کی تعلیم B.A ہے۔ وہ قرآن حکیم کی چند آیات کے حوالہ سے آئن سٹائن کے نظریہ اضافت (THEORY OF RELATIVITY) کا انکار کرتے ہیں حالانکہ اس نظریہ اضافت کے سلسلہ میں قرآن پاک سے ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں ان سب حضرات میں قدر مشترک یہ ہے کہ عام طور پر وہ سائنس نہیں جانتے، مغرب سے بے حد مرعوب ہیں، مسلمانوں کی سائنسی پسماندگی کو محسوس کرتے ہیں چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وہ پہلے اپنے ذہن میں کوئی نام نہاد PSEUDO سائنسی تھیوری بنا لیتے ہیں اور پھر اس کے ثبوت کے لئے قرآن کریم سے آیات ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔

قرآن کریم کے حوالہ سے اس طرح کا کام نہایت ہی خطرناک بات ہے۔ ایسا کام

کرنے والوں کواللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرنا چاہئے کہ جب لوگ ان کی بنائی ہوئی سائنسی تھیوری کو جھٹلائیں گے یا مذاق اڑائیں گے تو بے سوچے وہ قرآن کریم کو بھی جھٹلائیں گے اس لئے قرآن حکیم کے حوالہ سے جدید علوم ایک نازک مسئلہ ہے جس پر کام نہایت محتاط طریقہ سے اولی الالباب ہی کو زیب دیتا ہے ایسے لوگوں کا کام جدید دور کے لئے بھی قابل قدر خدمت ہوگی۔

سائنس کی حدود

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ قرآن پاک اور سائنس میں کیا تعلق ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن حکیم حق ہے اور سائنس حق کی تلاش ہے لیکن جدید سائنس کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ حق کی تلاش کے لئے صرف مادی طریقوں پر انحصار کرتی ہے اور مادیات کے ماورئ اقرار نہیں کرتی جس کی وجہ سے سائنس کی دسترس کائنات میں بہت محدود ہے چنانچہ موجودہ سائنسی فہم (INSIGHT) اور طریقہ کار خود ہی سائنس کی مزید ترقی پر بہت بڑی رکاوٹ بنتا جارہا ہے۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کے مطابق رفتار کی آخری حد خلاء میں روشنی کی رفتار یعنی 3 لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ ہے۔ دیکھنے میں یہ بہت بڑی رفتار ہے لیکن کائنات کی وسعتوں کے اعتبار سے یہ اس قدر کم ہے کہ بفرض محال انسان یہ رفتار حاصل کر بھی لے تب بھی وہ پوری حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس طرح مادی سائنس نے اپنی پہنچ کی حدود خود ہی محدود کر دی ہیں۔ یوں وہ پوری حقیقت کا تجرباتی طور پر ادراک کبھی بھی نہیں کر سکتی۔

جیسے بڑی سے بڑی حقیقت کے سلسلہ میں سائنس محدود ہے اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی حقیقت کی پہچان کے لئے بھی سائنسی دریافتیں کافی نہیں۔ مشہور سائنسدان ہیزن برگ (HEIZENBERG) کا ''نظریہ بے یقینی'' (UNCERTAINTY PRINCIPLE) یہ ہے کہ انتہائی باریک اور چھوٹی چیزوں کی ہئیت کو صحیح طور پر سمجھنا سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہے اس لئے کہ ایک خاص حد کے بعد ہمارے پاس مزید پیمائش کا کوئی طریقہ باقی نہیں رہ جاتا۔ بلکہ جس چیز کی مدد سے پیمائش کی جاتی ہے اس کے اپنے اثرات زیر تجربہ چیزوں کی ہیئت کو تبدیل کر دیتے ہیں

اوپر کی تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انتہا کے حقائق سائنس کی بساط سے باہر

ہیں اس لئے جو لوگ سائنس کو حرف آخر سمجھتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی یہ سوچ خود سائنس کے خلاف جاتی ہے۔ سائنس کی جدوجہد کا محور اجزا (PARTS) ہیں۔ کل یعنی ٹوٹل (TOTAL) کی حقیقت اس کے ادراک سے باہر ہے یعنی سائنس کے ذریعہ ٹوٹل سچائی کا ادراک ناممکن ہے اور کبھی سائنس اس بات کی دعویدار بھی نہیں رہی ہے۔ سائنس کا دائرہ کار صرف شہود تک ہے اور عالم الغیب اس کی دسترس سے باہر ہے۔ مثلاً زندگی اور موت کا درمیانی وقفہ تو کسی حد تک سائنس کے دائرہ کار میں آتا ہے لیکن زندگی سے پہلے اور موت کے بعد کے حقائق اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ مخلوق کو سمجھنے کی تو کسی حد تک دعویدار ہے لیکن خالق کے بارے میں خاموش ہے جسم کا تو تھوڑا بہت علم رکھتی ہے لیکن نفس اور روح کے معاملات اس کی پہنچ سے باہر ہیں یعنی ٹوٹل حقیقت کی تلاش میں سائنس ایک محدود ذریعہ علم ہے ان حالات (CIRCUMSTANCES) میں یہ سوال اہم ہے کہ سائنس کے دائرہ کار سے باہر کے حقائق کا انسان کو کیسے علم ہو؟ اس کا جواب وحی ہے۔ یعنی زمین پر آسان زندگی گزارنے کے لئے تو رب العالمین نے انسان کو سائنس کا علم دیا لیکن اس کی روحانی بالیدگی کے لئے اس نے وحی کا انتظام کیا۔

وحی اور سائنس میں فرق یہ ہے کہ سائنس عالم شہود (PHYSICAL REALM) کا علم ہے اور وحی عالم الغیب (METAPHYSICAL WORLD) کا علم ہے۔ تمام علوم اللہ ہی کی طرف سے ہیں اور جسے جتنا چاہئے وہ دے دیتا ہے۔ اس کی مرضی کے مطابق ہر دور میں سائنس اور وحی کے علوم اترتے رہے ہیں۔ جبکہ سائنس کے لئے اللہ تعالیٰ نے سائنسدان پیدا کئے وحی کے لئے وہ اپنے مخصوص بندے جنہیں پیغمبر یا رسول کہتے ہیں بھیجتا رہا۔ اس علم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آخری نبی اور ہمارے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر مکمل کر دیا۔ انسانیت کی یہ انتہائی خوش قسمتی ہے کہ سو فیصد شک وشبہ سے بالاتر وحی کا یہ علم قرآن حکیم کی شکل میں محفوظ ہے اور اس کی تفصیلات اور جزئیات حامل وحی ﷺ کی سنت میں موجود ہیں۔

قرآن حکیم یہ ثابت کرتا ہے کہ عالم شہود اور عالم الغیب آپس میں لاتعلق نہیں بلکہ دونوں باہم متصل (INTERLINKED) ہیں۔ اس لئے ظاہر سے باطن کی پہچان ہوگی، جبکہ ظاہر کی پوری حقیقت تک پہنچنے کے لئے باطن کا ادراک بھی ضروری ہے۔ مثلاً قرآن حکیم اس بات

پر زور دیتا ہے کہ اللہ خالق ہے لیکن خالق کی پہچان اس کی مخلوق سے ہوتی ہے صلوٰۃ ایک روحانی عبادت ہے لیکن جسمانی طور پر ادا کی جاتی ہے اور اس کی بنیادی تیاری وضو ہے جو پانی سے کیا جاتا ہے۔ غرض قرآن روح اور جسم، دنیا اور آخرت کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کرتا بلکہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ آخرت کا سامان اسی دنیا میں سے بن کر جاتا ہے۔ یہ سب ایک ہی وحدت کے مختلف نظارے ہیں۔ پہلی اور آخری حقیقت وحدت ہی ہے۔ سائنس اور مذہب دونوں کا مقصد اس حقیقت کا کلی طور پر ادراک ہے اور اسی تلاش میں انسان کی معراج ہے۔

روح جسم

روح اور جسم آپس میں باہم متصل ہیں

آخرت دنیا

دنیا و آخرت آپس میں باہم متصل ہیں

وحی سائنس

سائنس اور وحی آپس میں متصل ہیں

قرآن پاک سائنس کی انتہا ہے

سائنس اور قرآن حکیم کے دائرہ کار کو سمجھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ جو سائنس کی انتہا ہے وہ کلام اللہ کی ابتداء ہے۔ جب کہ قرآن حکیم ''کل'' ہے سائنس ''جز'' ہے۔ آپ اس بات کو قرآن حکیم کے وژن (VISION) اور مقصد (MISSION STATEMENT) میں دیکھ سکتے ہیں۔ جو سورۃ فاتحہ (OPENING SURA) کا مضمون ہے فرمایا! اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔

یہاں قرآن ایک دنیا کی نہیں دنیاؤں کی بات کرتا ہے، ایک کائنات کی نہیں کائناتوں کی بات کرتا ہے اور پھر یہ بھی بتاتا ہے کہ کائناتوں کا وجود بھی ہمیشہ کے لئے نہیں۔ پھر یوم حساب ہوگا۔ یہی تو بیسویں صدی کے آخیر میں سائنس کی آخری حد کا مضمون رہا ہے۔ اور اب بھی ہے کہ

کائنات میں ہمارے علاوہ بھی ایسے اور سیارے ہونگے جہاں انسان بستے ہیں۔اور یہ سارا نظام زوال پذیر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلام اللہ سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہے لیکن سائنس کلام اللہ کے دائرہ کار سے باہر نہیں۔ یہ ایک ٹوٹل حقیقت (SUPERSET) ہے وہ اس کا ایک ادنیٰ حصہ ہے قرآن حکیم کل (HOLISTIC APPORACH) کی تعلیم دیتا ہے جبکہ سائنس جزئیات (PARTIALS) کے متعلق بات کرتی ہے اور جیسے اوپر کہا گیا ہے کہ ''سائنس دنیا کے لئے ہے'' قرآن دنیا و آخرت دونوں کے لئے رہنمائی کرتا ہے اسی لئے مؤمن قرآن حکیم کے ذریعہ سائنس اور وحی دونوں کی حقیقت کا داعی ہے اور دونوں کی بھلائی کا متلاشی ہے اس کی دعا ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (سورۃ البقرہ 201) حضور ﷺ کے مطابق علم مومن کا ہتھیار ہے آپ ہی کی دعا تھی رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا (سورۃ طٰہٰ 114) اس دعا میں علم وحی اور علم سائنس دونوں شامل ہیں۔

اب ہم اس طرف آتے ہیں کہ قرآن حکیم میں کس قدر سائنس ہے۔اس سوال کو سمجھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے فرق کو سمجھیں سائنس دراصل قدرت کے اصولوں سے آگاہی کا نام ہے جبکہ ٹیکنالوجی ان اصولوں کے استعمال کا نام ہے۔مثلاً موجودہ زمانہ الیکٹرانک کمیونیکیشن (ELECTRONIC COMMUNICATIONS) کا حیران کن دور ہے ٹیلی فون، موبائل فون، ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر اور سیٹلائٹ ذرائع ابلاغ وغیرہ نے دنیا بھر میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی کا نتیجہ ہیں لیکن ان سب کے کام کرنے کا بنیادی اصول الیکٹرومیکنیٹک ریڈیشن (ELECTROMAGNETIC RADIATION) ہے جس کے اصولوں کو میکسویل (MAXWELL) نے 1860ء میں دریافت کیا تھا ایک اور مثال ایٹمی توانائی کی ہے جس کے مرہون منت دنیا بھر میں چلنے والے ایٹمی ری ایکٹرز ہر طرح کے ایٹمی ہتھیار اور تمام طرح کے ایٹمی ریڈیشن (ATOMIC RADIATION) پر چلنے والے آلات ہیں ان سب کا بنیادی عنصر یہ سائنسی اصول ہے کہ مادہ توانائی میں تبدیل ہوسکتا ہے جو آئن سٹائن نے 1904ء میں دریافت کیا تھا۔مزید آگے بڑھیں تو معلوم ہوگا کہ میکسویل اور آئن سٹائن کی

دریافتوں کا تعلق بھی دراصل ایٹم کی ساخت سے ہی ہے کہ ہر چیز انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنی ہے جو اپنی ہیئت میں کبھی مادہ کبھی توانائی ہوتے ہیں اور توانائی کی تمام اشکال ان کے مختلف حالات کا اظہار ہیں۔لیکن یہ سب کچھ ایک وحدت (SINGULARITY) ا حصہ ہے جو کائنات کی اصل حقیقت ہے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ سائنس کا تمام کاروبار چند بنیادی سچائیوں پر قائم ہے اور یہ قدرتی قانون زندگی کے ہر شعبہ میں محرک نظر آتے ہیں۔ان کی دریافت اور سمجھ بوجھ ہی اصل سائنس ہے۔باقی جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ انہی اصولوں کی عملی اشکال اور تفصیلات ہیں وحدت کے معیار کے مطابق قرآن حکیم کائنات میں سب سے بڑی سائنسی کتاب ہے۔جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر چیز کی بنیاد فراہم فرمادی ہے اس کتاب میں خالق کائنات نے ہر طرح کی مادی، عمرانی معاشی، اخلاقی اور روحانی سائنسوں کی بنیاد رکھ دی ہے۔تفصیلات کا کام انسان پر چھوڑ دیا گیا ہے لیکن وہ علوم جن کی تفصیل کا مادی ذرائع سے جاننا انسانی بس سے باہر تھا۔مثلاً عالم غیب کے حقائق یا اخلاقیات کے اٹل اصول یا روحانیت وغیرہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک ﷺ کے ذریعے مفصل طور پر سمجھا دیا۔

قرآن حکیم کا سائنسدان۔علم وحکمت کا شاہکار مسلمان

اس ضمن میں سب سے اہم سوال خود انسان کی اپنی حقیقت ہے جس پر ہم باب نمبر 2 میں بات کر چکے ہیں۔سائنس نے اس کے جسم کے مادی اجزاء پر تو خوب بحث کی ہے لیکن انسان بحیثیت انسان کا جواب سائنس کی کسی کتاب میں نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کا علم صرف مادیات تک محدود ہے یعنی ''سائنس کے لئے انسان کائنات کا ایک حصہ ہے۔بقول اقبال

نہ تو زمیں کے لئے ہے، نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے

جب کہ وحی کے مطابق کائنات انسان کا ایک حصہ ہے، اور یہی دونوں کی سوچ میں بنیادی فرق ہے اور یہ ایک بہت بڑا فرق ہے اس کے مطابق ''سائنس کا انسان مادہ کا غلام ہے جب کہ قرآن کا انسان کائنات کا حکمران ہے'' ارشاد ربانی ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِیُ الۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَھُمَا (سورۃ الجاثیہ 13) اور تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کچھ مسخر کر دیا گیا ہے۔

قرآن پاک کا انسان کائنات میں ایک مکرم ہستی ہے فرمایا! وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (سور بنی اسرائیل 70) یعنی ''بلا استثنٰی ہم نے آدم کی اولاد کو قابل عزت بنایا ہے'' یہ آیت مبارک انسان کیلئے خداوند کائنات کی طرف سے گویا لیٹر آف اتھارٹی (LETTER OF AUTHORITY) ہے کہ ''قرآن پاک کا انسان نہ صرف مکرم ہے بلکہ کائنات اس کے سامنے سرنگوں کر دی گئی ہے'' اس عظیم اصول کہ ''کائنات کا مرکز انسان ہے'' کے مطابق تمام کی تمام کائنات کو انسان کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت حاصل ہے انسان کی لامحدود صلاحیتوں والے اس قانون کی تشریح قرآن پاک میں حضرت آدم علیہ السلام کے ظہور کے متعلق قرآنی آیات میں اچھی طرح کر دی گئی ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیات مبارکہ 31 سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ہر تخلیق کا علم بخشا اور فرشتوں پر اپنی اس نئی تخلیق کی برتری ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کائنات کو بطور امتحان آگے رکھ دیا۔ دونوں سے ان کے خواص کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق ہر چیز کے متعلق صحیح صحیح جواب دیا جبکہ فرشتوں نے اپنی کم فہمی کا کھلے بندوں اعتراف کر لیا۔ اس امتحانی کامیابی کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مسجود ملائک ہونے کا عظیم شرف عطا فرمایا۔

علم حاصل کرنے کی وہ صلاحیت آج بھی اولاد آدم کے جین (GENE) میں چلی آتی ہے۔ اس کی صلاحیتوں کا یہ حال ہے کہ ایک عام آدمی اپنی زندگی میں شاید ہی پانچ فی صد سے زیادہ ان کا استعمال کرتا ہو جبکہ بہت لائق اور عظیم لوگ شاید دس سے پندرہ فی صد کرتے ہونگے۔ آیت مبارکہ وَسَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَھُمَا انسان کو ودیعت کی گئی بے مثال صلاحیتوں کا اعلان ہے، اور ابتدائے تخلیق میں فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کروانا انسان کی برتری کا عملی اعتراف ہے۔

اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ قدرت کے قوانین انسان کی گرفت سے باہر نہیں ہو سکتے۔ بحیثیت مجموعی قرآن کے انسان کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر وہ

اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے تمام کائنات کو اس حد تک زیر نگوں کر سکتا ہے جس تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہو۔

''سخر لکم'' والا قانون ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ کائنات میں ہر چیز اگر چہ ظاہراً خواہ انسان کے لئے خطرناک بھی کیوں نہ ہو، دراصل کسی نہ کسی پہلو سے انسانی بقا اور ترقی کے لئے کام کر رہی ہے۔ لہٰذا زہر میں بھی تریاق ہے اسی اصول پر قرآن کریم ''سائنس برائے انسان'' پر زور دیتا ہے، یہ نہیں جیسے کہ سیکولر تہذیب نے کر دیا ہے کہ انسان سائنس کا غلام بن جائے۔ بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ سائنس صرف انسان کی بہتری کے لئے استعمال ہو۔

قرآن حکیم انسان کو اس بات کی خوشخبری سناتا ہے کہ اس کی روح امر ربی ہے اس لحاظ سے وہ اپنی حد تک تمام خدائی صفات اور طاقتوں کا مظہر ہے مثلاً اللہ تعالیٰ خالق ہے اس لئے اپنی حد تک انسان بھی خالق ہوگا اللہ تعالیٰ حکیم ہے اس لئے اپنی حد تک آدمی بھی حکمت رکھتا ہے امر ربی کی بنا پر خدائی صفات کا مظہر ہونا انسان کے لئے اتنا بڑا اعجاز ہے کہ جس کی کائنات میں کوئی دوسری مثال نہیں۔ وہ جو اس معیار پر پورا اترتے ہیں زمین پر خلیفہ کہلانے کے حق دار ہیں افسوس ان دانشوروں پر جو انسان کو بھی حیوانوں کے زمرہ میں ڈال دیتے ہیں۔

قرآن پاک میں سائنس کی تلاش

قرآن حکیم کی حکمت اور سائنس کو سمجھنے کے لئے اس مثال پر غور فرمائیں کہ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں جتنا بڑا آدمی اتنی بڑی اس کی باتیں۔ ان کی باتیں دنیا جہان کے علوم کی مثالوں اور معلومات سے بھرتی ہوتی ہیں جن میں سے سننے والا اپنی سمجھ شوق اور ہمت کے مطابق بہت کچھ اخذ کر لیتا ہے۔

اب فرض کریں کہ وہ ہستی جو آپ سے باتیں کر رہی ہے ساری کائنات کی حکمران بلکہ اس کی خالق بھی ہو۔ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام راز اس کے سامنے ظاہر ہوں۔ وہ لوگوں کے اندر کے خوف اور غم اور اس کی سوچوں سے آگاہ ہو تو اس ہستی کے کلام میں کیسی کیسی حکمت اور سائنس ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ سمجھنے والے کے لئے قرآن کریم کی باتوں میں وہ گہرائی ہے جو کسی

سمندر میں نہیں، اس میں وہ خوبصورتی ہے جو کسی پھول میں نہیں، وہ معلومات ہیں جو کسی انسائیکلوپیڈیا میں نہیں، یہ وہ معجزہ ہے جس کی مثال نہیں۔ گزشتہ انبیاء کے بھی معجزات تھے لیکن وہ انسان کے ذہن کان اور آنکھ کو وقتی طور پر مسخر کرتے تھے لیکن قرآن پاک رب لعالمین کی طرف سے رحمت للعالمین پر ذکر اللعالمین کے طور پر نازل ہوا جب سے اور جب تک عالمین یعنی کائنات قائم دائم ہے نہ رب کی ربوبیت میں، نہ رحمت للعالمین کی رحمت میں، اور نہ ذکر للعالمین کے ذکر میں کمی ہوگی۔

چنانچہ قرآن پاک وہ زندہ حقیقت ہے جو دنیا و آخرت یعنی زمان و مکان کے تمام مقامات پر انسان کی رہنمائی کرتا رہے گا اور جو کوئی بھی ہدایت کے لئے اس کی طرف آئے گا۔ یہ اس کے ذہن، فکر، قلب اور روح کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ اسی کی برکت اور اس کا فضل، زمان و مکاں کے اوپر سدا جاری و ساری ہے اور یوں یہ حضور ﷺ کے خاتم النبیّین اور رحمۃ للعالمین ہونے کا بھی کھلا ثبوت ہے اس سے پہلے جو دین اترے وہ بھی لوح محفوظ میں سے لئے گئے قرآن حکیم کے اجزاء تھے، اور اب یہ کل صورت میں ہمارے پاس ہے۔ (اللہ تیرا شکر ہے) ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم طالب علم بن کر سچے دل اور عقل سے اس پر غور کریں اور اپنی باتوں کو چھوڑ کر اس کی باتیں سمجھیں۔ پھر ہمیں تمام دیگر مذاہب کی حکمت کی باتیں بھی یہیں ملیں گی اور اسی میں سے ہمیں دنیا اور آخرت کے ایسے ایسے حقائق کا پتہ چلے گا جن کو ماہرین عمرانیات، معاشیات، اخلاقیات غرض ہر طرح کے سائنس دان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جبکہ سائنس ''کیا'' اور ''کیسے'' میں پھنسی ہوئی ہے قرآن ''کیوں'' کا حتمی جواب دیتا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جہاں انسانی عقل کی انتہا ہے وہاں قرآن پاک کی ابتداء ہے جہاں فزکس کے ماہرین نہ پہنچ سکے وہ راز یہاں ہے جو فلاسفر کی عقلوں سے بالاتر ہے وہ حکمت کی باتیں اس میں ہیں۔ غرض ظاہر اور باطن کے ہر علم کی بنیاد اس میں موجود ہے اس لئے کہ یہ کلام اللہ ہے سمجھنے کے لئے صرف ایک قلب سلیم کی ضرورت ہے۔

قرآن فہمی کے اصول

قرآن پاک سے علم و حکمت کے موتی چننے کے لئے مندرجہ ذیل اصول لازمی ہیں:

☆ پہلی بات پختہ یقین ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کا کلام ہے اس لئے اس کا حرف حرف حق ہے اور لفظ لفظ سچ ہے۔ ہمیں سمجھ آئے یا نہ آئے اس کی آیت آیت حکمت ہے اس ذہن اور صدق دل سے اگر ہم رجوع کریں تو تھوڑی سی محنت کے بعد قرآن حکیم اپنی حکمت ہم پر کھولنے لگے گا۔ (ان شاءاللہ)

☆ قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے دوسری اہم بات یہ ہے کہ مولا کریم کا شریک بننے سے ہر صورت میں بچا جائے۔ ایسا قاری قرآن پاک میں اپنے رب کی حکمت کی بجائے اپنے ذہن کو تلاش کر رہا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے کئی علماء اور مفسرین اس گناہ میں مبتلا ہیں وہ اپنے گھڑے ہوئے مفروضوں کو قرآن پاک کی آیات سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کلام اللہ کی بجائے وہ قرآن پاک کی آیات کے ذریعہ اپنی سوچوں اور عقائد کا پرچار کرتے ہیں۔ اسی حوالہ سے اقبال کہتے ہیں کہ:

؎ احکام تیرے حق ہیں، مگر تیرے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

یہ طریقہ نہ صرف انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے بلکہ بہت خطرناک ہے۔ جو آدمی قرآن پاک پر جھوٹ بولتا ہے اس کے لئے جہنم کی آگ ہے۔ (اعوذ باللہ)

☆ بہت سے ''بے وقوف دوست'' ایسے بھی ہیں جو قرآن کریم سے مخلص تو ہوں گے لیکن ان کا علم بہت محدود ہوتا ہے۔ وہ نہ سائنسدان ہوتے ہیں اور نہ قرآن فہمی کے عالم ہوتے ہیں۔ بس سائنس سے مرعوب ہو کر قرآن پاک کی عظمت کو سائنس کی مدد سے ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ قرآن کو اپنی عظمت کا لوہا منوانے کے لئے کسی طرح کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اپنی جہالت کی بنا پر کلام اللہ میں سے کسی آیت کو عجیب سا معنی دے کر بلا تحقیق اپنے وہم کا فوری اعلان کر دیتے ہیں۔ قرآن فہمی کا یہ طریقہ انتہائی بے ادبی اور غیر ذمہ دارانہ رویہ کا مظہر ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ ایسی جہالت سے بچائے۔

☆ غیر ذمہ دارانہ نتائج سے بچنے کیلئے قرآن فہمی کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ تقویٰ کے بغیر

قرآن کی تفسیر نہ کی جائے، اور قاری ہر ممکنہ حد تک کلام الٰہی کے الفاظ کے قریب ترین رہے اور ان میں اپنے ذہن کے معنی تلاش نہ کرے الفاظ کے مروجہ معنی کے ساتھ ان کے مصادر (ROOTS) پر غور کرے تا کہ سمجھ آئے کہ قرآن پاک اسے کیا کہہ رہا ہے اس کے لئے کسی مستند لغت کی مدد لینا بھی ضروری ہے لیکن صرف اپنے من پسند معنوں پر اتفاق نہ کرے بلکہ الفاظ کے تمام معنوں پر برابر کاوش کر کے نہایت تقویٰ اور اخلاص سے اپنی رائے قائم کرے۔

☆ چونکہ قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کوئی کجی نہیں رکھی وہ اپنی بات کرنا خوب جانتا ہے اس لئے اگر کسی لفظ کے ایک سے زائد معنی ہوں تو وہ سب بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ قرآن پاک اپنی تفسیر آپ ہے اور اس کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ مشکل مضامین نظریات اور عقائد کو مختلف اسلوب سے قرآن پاک میں کئی تناظر میں دہرایا گیا ہے تا کہ قاری اپنے رب کی منشا کی تہہ تک بغیر کسی غلطی کے پہنچ سکے۔ لہٰذا کسی خاص مضمون پر جس قدر آیات ہوں ان پر علیحدہ علیحدہ اور اکٹھا بھی غور کیا جائے اور پھر کوئی نتیجہ نکالا جائے۔ اس لئے جن مفسرین کے سامنے پورا قرآن پاک نہیں ہوتا وہ کافی غلطیاں کرتے ہیں۔

☆ یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ قرآن پاک کو جناب صاحبِ قرآن ﷺ کی مبارک شخصیت کو سمجھے بغیر سمجھنا ناممکن ہے اس لئے قرآن فہمی کے لئے ایک طرف اگر سارے قرآن پاک پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تو دوسری طرف سیرت طیبہ، احادیث مبارکہ اور تاریخ اسلام کی کتابوں پر عبور ہونا بھی بہت ضروری ہے اور جیسے کہا گیا ہے کہ ''زمانہ خود قرآن کریم کی تفسیر ہوگا'' اس کے ساتھ ساتھ جدید ترین سائنسی علوم کا صحیح ادراک بھی قرآن فہمی کے لئے ضروری امر ہے۔

قرآن پاک اور سائنس کی بنیادیں

جہاں تک کائنات میں براہ راست سائنسی رازوں اور اس کے پیچھے ''کیوں اور کیسے'' کو سمجھنے کا مسئلہ ہے قرآن حکیم چونکہ علیم البصیر، عزیز الحکیم خالق السمٰوٰت

والارض وما بینھما کا کلام ہے۔اس لئے جیسے ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں گا ہے گا ہے اس میں کائنات کے متعلق کیوں اور کیسے کے جواب بھی مل جاتے ہیں۔''قرآن کے مطابق کائنات کی بنیاد وحدت کے کلیہ پر استوار ہے۔ واحد اللہ اس کا خالق ہے اور اس کی تخلیق کا مرکز انسان ہے، اور زمان ومکاں کی تمام سمتوں میں ایک ہی قانون کام کرتے ہیں''۔ یہ وہ نکات میں جن کی سائنسی اہمیت بے پایاں ہے اس کلیہ کی روشنی میں قوانین قدرت کو جاننے اور سمجھنے میں بڑی آسانی رہے گی۔لیکن یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ بھرپور سائنسی انکشافات کی طرف اشاروں کے باوجود قرآن پاک کسی لحاظ سے بھی سائنس کی درسی کتاب نہیں۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ درحقیقت سائنس یعنی علم الاشیاء کوئی ایسی بات نہیں کہ اس کیلئے وحی بھیجی جاتی بلکہ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہی میں اس علم کو ودیعت کر دیا تھا یعنی سائنسی علوم انسان کے جینیاتی نظام(GENETIC MAKE-UP) کا حصہ ہیں۔لہٰذا سائنسی علوم تمام بنی آدم کی برابر کی میراث ہیں اور جو کوئی بھی محنت کرے گا ضرور پائے گا۔(مَنْ طَلَبَ وَجَد) لیکن اصل جاننے کی بات یہ ہے کہ سائنس کا اپنا مقصد کیا ہے؟ یہ وہ بات ہے جو کوئی محنت نہیں سکھا سکتی اور دراصل یہی جدید دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔اس کے نزدیک ''سائنس برائے انسان'' کے بجائے سائنس برائے تجارت یا ''سائنس برائے سائنس'' ہے۔

قرآن حکیم جہاں زندگی کے دیگر تمام مسائل کے لئے صراط مستقیم ہے وہاں سائنس کی بھی صحیح سمت میں رہنمائی کرتا ہے کہ ''سائنس برائے انسان'' ایمان کا ایک درجہ ہے۔اس اصول کے مطابق کائنات کی ہر چیز انسان کے کسی نہ کسی فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے اور وہ بھی بیتاب ہے کہ کسی انسان کے کام آجائے۔ وہ شدید خواہش رکھتی ہے کہ انسان اسے سمجھ پائے اس لئے کہ وہ اسی کے لئے بنائی گئی تھی۔اس کی خوشی ہی اس بات میں ہے کہ آدمی اسے استعمال کرے۔ یوں اشیاء اور انسان ایک ہی وحدت کے دو جوڑے ہیں۔اس اصول کے تحت کائنات کی ہر چیز انسان کی طرف کشش رکھتی ہے اسے محبت کرتی ہے اس کی تعظیم کرتی ہے اس لئے کہ وہی غائت کائنات ہے افسوس کہ مغربی سائنس اس نکتہ سے بالکل آگاہ نہیں۔ جب تک وہ کائنات کو انسان سے جدا

محض مادی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کریں گے وہ حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکیں گے۔ بلکہ جیسا کہ ہو چکا ہے سائنس سرمایہ دار کا آلہ کار بنی رہے گی۔

قرآن پاک کا ظاہر و باطن

فہم قرآن کیلئے اسلوب قرآن سے بھی آگاہ ہونا بہت ضروری ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں سے پہیلیوں میں باتیں نہیں کرتا۔اس کی باتیں صاف ظاہر اور مکمل ہوتی ہیں۔ یہ کوئی شاعری نہیں نہ ہی کوئی جادوٹونے کے جملے ہیں جن میں دقیق اور نا قابل سمجھ جملوں میں اصل کو نقل اور سچ کو جھوٹ سے ملا کر پیش کیا جاتا ہے بلکہ اس کی ہر آیت مبارکہ بذات خود ایک کھلی دلیل جچے تلے الفاظ اور انتہائی ذمہ دارانہ کلام ہے اس لئے قرآن حکیم کی آیات مبارکہ میں باطنی معنی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔اس کا ظاہر و باطن ایک ہی ہے۔ نہ ہی اس میں عوام اور خواص کی تفریق کی گئی ہے کہ کچھ حکم عوام کے لئے ہیں اور کچھ خواص کے لئے یا ظاہری معنی عوام کے لئے اور باطنی معینی خواص کے لئے ہیں ایسا ہرگز نہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک ہدایت کے لئے اس کے سبھی بندے برابر ہیں وہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور علیٰ الاعلان بتاتا ہے کہ جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہو سکتے۔یعنی قرآن حکیم میں ظاہر باطن والی بات نہیں بلکہ جاننے یا نہ جاننے کی بات ہے۔اس کی آیات مبارکہ انسان کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں اور جس قدر کوئی گہرا غوطہ زن ہوگا علم کے اس وسیع وعریض وعمیق سمندر میں سے وہ اپنی استطاعت اور ہمت کے مطابق موتی چن لے گا۔حتیٰ کہ جو کنارے پر کھڑے صرف دیدار کرنے والے ہیں وہ بھی اس رحمت کی پھوار سے مستفید ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورۃ الکہف میں فرمان ہے کہ ''اگر سمندر سیاہی بن جائیں۔ یہ ختم ہو جائیں گے لیکن میرے رب کی باتیں ختم نہیں ہوں گی'' اور اسی بارے میں عظیم مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول القرآن یفسرہ الزمان (حوالہ تفسیر نمونہ مقدمہ جلد 1) یعنی ''زمانہ قرآن پاک کی تفسیر کرتا ہے'' مطلب یہ ہے کہ جوں جوں علوم انسانی ترقی کریں گے قرآن حکیم کی حکمت انسان پر مزید واضح ہوتی جائے گی۔کلام اللہ خود اس بات پر شاہد ہے کہ قیامت سے پہلے انسان کی اپنے اندر اور باہر کی دنیا میں قرآن پاک کی سچائی کے متعلق بکھرے ہوئے تمام شواہد

سائنس کی صورت میں ہویدا ہو جائیں گے۔اس لئے قرآن پاک ایک مستقل حقیقت ہے اس کی خوبیاں کبھی ختم نہ ہوں گی اس کی باتیں کبھی پرانی نہ ہوں گی اور قیامت تک ہر آنے والا مفسر اپنے زمانہ کی استعداد کے مطابق اس میں سے حکمت کے موتی چنتا رہے گا۔

مفسرین کی ذمہ داری

اس سب کا مطلب یہ ہے کہ سائنسی علوم پر عبور اللہ تبارک تعالیٰ کی کتاب پر غور وفکر کے لئے ضروری ہے۔مفسرین کی ذمہ داری ہے کہ فی زمانہ تقویٰ کی حدود میں رہتے ہوئے محکم سائنسی علوم کے حوالہ سے قرآن پاک کی تفسیر کریں اگر کوئی محقق اور مفسر خالص نیک نیتی اور علم کی پیاس سے قرآن پاک کی طرف رجوع کرے گا تو اللہ تبارک تعالیٰ ضرور اس پر اپنی حکمت واضح کرے گا (ان شاء اللہ) لہٰذا سائنس کے حوالہ سے جو قاری قرآن پاک کو سمجھنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ متقی بن کر اپنے آپ کو بھول کر، قرآن پاک میں غوطہ زن ہو اور جدید علوم اور سائنس کے محکم حقائق کی روشنی میں اس میں اپنا ذہن ڈھونڈنے کی بجائے اللہ تبارک تعالیٰ کی حکمت تلاش کرے۔

دین اسلام کا تقاضہ
خلافت کا قیام ہے

پروفیسر خالد شبیر احمد

دین اسلام دین ہے نظریہ نہیں کہ جس میں بوقت ضرورت تبدیلی کی جا سکے۔ کیونکہ دین نام ہے ان اصولوں اور ضابطوں کا جن کو خدا نے خود اپنی مخلوق یعنی بنی نوع انسان کے لئے مقرر فرما دیا۔ وہ اصول وضوابط جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت ﷺ تک پیغمبروں کے ذریعے انسانوں تک پہنچائے گئے۔ آپ ﷺ کی ذات اقدس پر دین اسلام کی تکمیل کر دی گئی اور اب قیامت تک دین اسلام کے بنیادی اصولوں میں کسی قسم کا کوئی تغیر وتبدل ممکن نہیں رہا۔ اب انسان نے اپنے آپ کو اسلام کے اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہے نہ کہ اسلام کو انسانی خواہشات کے تابع کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے صرف کائنات ہی نہیں بنائی بلکہ دیگر مخلوقات کے ساتھ ساتھ امتیازی خصوصیات کے حامل انسان کو بھی تخلیق کیا اور اسے معاشرے کے اندر زندہ رہنے کے اصول و ضوابط سے بھی آگاہ کر دیا تا کہ انسان اپنی زندگی کو ان اصولوں کے مطابق ڈھال کر جہاں دنیا کے اندر آسودگی اور راحت حاصل کرے وہاں عاقبت کی سرخروئی بھی حاصل کر سکے۔ تکمیل دین کے بعد کسی حرام کو حلال اور کسی حلال کو حرام نہیں کہا جا سکتا۔ حتیٰ کہ خود پیغمبر وقت بھی اس بات کے مجاز نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اسلام کے کسی اصول کو تبدیل کر سکیں۔ چنانچہ اس بے اختیاری کے بعد کسی دوسرے انسان کے لئے ترمیم وتغیر کے اس حق کا تصور بھی دین اسلام سے بغاوت کے

مترادف ہے۔

اٹل الہامی فیصلہ کے برعکس دین بارے کسی مفکر کی سوچ بچار کو اس کے فکری تجسّس وتفکر کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر معروف کلیہ کے مطابق مفکر چونکہ عام آدمی کی نسبت زیادہ فہیم اور صاحب بصیرت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سیاسی، معاشی، معاشرتی یا کسی بھی دوسرے موضوع پر زیادہ بہتر طور پر سوچ سکتا ہے بعض اوقات اس کی سوچ میں اس قدر گہرائی ہوتی ہے کہ ایک لمبے عرصے تک اس کی وہ سوچ ایک نظریے کے روپ میں انسانی زندگی میں ایک رہنما اصول کا کام بھی دیتی ہے لیکن ایک خاص عرصے کے بعد ایک نظریہ غلط بھی ثابت ہوسکتا ہے یا پھر اس نظریے میں وقتی مصلحتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے تبدیلیاں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ آپ دیکھئے کہ ارسطو اور افلاطون ایک ہی دور کے دو مفکر تھے مگر کئی نظریات میں ایک دوسرے سے مختلف خیالات رکھتے تھے۔ اس طرح تخلیق ریاست کے حوالے سے نظریہ معاہدہ عمرانی کے پیش کرنے والے مفکرین ہابز لاک یا روسو بھی ایک دوسرے سے مختلف نظریات پیش کرتے ہیں، چنانچہ یہ دلیل ثابت کرتی ہے کہ دین اور نظریہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ جن کے درمیان اتنا ہی فرق ہے جتنا خود خداوند تعالیٰ اور اس کی مخلوق انسان کے درمیان ہے۔ دین ان عقائد پر مشتمل ہے جو ابدی ہیں اور اپنی ہیت ترکیبی کے اعتبار سے انسانی فکر کی دسترس سے باہر ہیں، جبکہ نظریات اس کے مقابلے میں عارضی ہیں اور ہمیشہ انسانی فکر سے ہی سرزد ہوتے اور پھر اس کی زد میں بھی رہتے ہیں، دین اور نظریہ کے اس فرق کو حکیم الاسلام حضرت علامہ قاری محمد طیب رحمۃ اللہ نے اس طرح واضح کیا ہے۔

''نظریہ عقل سے بنتا ہے اور عقیدہ خدا اور رسول ﷺ کی خبر ہے۔ عقیدہ دین ہوتا ہے اور نظریہ رائے، عقیدہ واضح ہوتا ہے اور نظریہ تخمین واٹکل، پس عقیدہ جو خدا اور رسول کی خبر سے بنا ہے نظریہ نہیں ہے جسے ہم نے تخمین واندازہ یا کسی تاریخی ریسرچ پر دل میں بنا لیا ہو اس لئے اگر کوئی نظریہ خواہ وہ تاریخی ہو یا فلسفی عقیدے سے ٹکرائے گا تو عقیدے کو بہر حال محفوظ رکھ کر نظریے کو کسی توجیہ سے اس کے تابع کیا جائے گا بشرطیکہ یہ کسی اونچی شخصیت کا ہو ورنہ'' کالائے بد بریش خادند'' کہہ کر دیوار پر مار دیا جائے گا کیونکہ عقیدے کا رد وقبول کسی تاریخی یا فلسفی نظریے کے معیار سے نہیں ہوسکتا بلکہ نظریے کا رد وقبول عقیدہ کے معیار سے ہوگا۔ (شہید کربلا و یزید، قاری محمد طیب

صفحہ (80-81)

ہماری سیاسی زندگی میں دوسری قباحت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ ہم نظریات کو عقائد پر فوقیت دیتے ہیں جس سے عقائد کی توہین واہانت ہی نہیں بلکہ دینی اقدار کی گرفت معاشرے پر ڈھیلی پڑ جاتی ہے جس کے بعد معاشرہ ایسی قیادت کے قابل نہیں رہتا جس سے دینی سیاست کا عمل جاری رکھا جاسکے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایسی سیاست کی طرف لوٹ آئیں کہ سیاست ہمارے دین کے تابع ہوکر ہماری سیاسی زندگی کی رہنمائی کرے تو اس کے لئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ ہم عقائد ونظریات میں جو فرق ہے اسے پیش نظر رکھیں تا کہ عقائد کی اولیت عقائد کی عظمت اور عقائد کا احترام باقی رہے، نظریات کو ان کے مقام پر ہی رہنے دینا چاہئیے اگر اس مقام سے نظریات کو آگے بڑھا کر عقائد اور دین کے مقام پر لے آئیں گے یا عقائد سے بھی زیادہ مقام دینا شروع کردیں گے تو پھر سیاسی زندگی میں ایسی ابتری پیدا ہوگی جس کا علاج انسانی دسترس سے باہر ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کلیہ پر کاربند ہونا ضروری ہے کہ عقائد پر نظریات کو قربان کیا جا سکتا ہے مگر نظریات پر عقائد کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔

آج پاکستانی سیاست کی تباہی اور بربادی کا سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے سیاسی نظریات ہمارے دینی عقائد سے مقدم سمجھے جاتے ہیں۔ گویا کہ دوسرے الفاظ میں ہم خدا اور رسول اللہ ﷺ کی بات کو مفکرین سیاست کی بات پر ترجیح نہیں دیتے۔ یہ ہماری جہالت ہے یا ہمارا خبث باطن؟ جو بھی ہو بہر حال اس انداز فکر ونظر نے ہماری سیاسی زندگی کو ایک ایسا ڈھب عطا کیا ہے جو سراسر غیر اسلامی ہے اور جس کی موجودگی میں ایسی سیاست کا تصور ممکن نہیں جو ہمیں دینی اقدار کے عملی نفاذ کی منزل تک لے جا سکے۔ افسوس تو اس امر پر ہے کہ ہمارے عوام ہی نہیں علمائے دین تک سیاسی میدان میں اس بنیادی بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس کو وہ منبر رسول ﷺ پر بیٹھ کر اپنی تقریروں میں غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں قول وفعل کا یہ تضاد عوام میں ان کے اعتماد کو دن بدن مجروح کرتا جارہا ہے جس کا ہمارے دیندار لوگوں کو احساس تک نہیں ہے۔

''وائے ناکامی کہ احساسِ زیاں جاتا رہا''

اسلامی ریاست کے بغیر دین اسلام کا کوئی کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وہ دین جس کی

تکمیل آنحضور ﷺ کی ذات اقدس پر ہو چکی ہے آپ کے خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے وہ پوری امتِ مسلمہ کو ورثہ میں ملا ہے جسے قیامت تک آگے بڑھانے کی ذمہ داری اب مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے لیکن دین اپنی اصلی شکل میں معاشرے کی اندر اس وقت تک رائج نہیں ہوسکتا جب تک دین مسند اقتدار پر براجمان نہیں ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس بات کا پابند ہے کہ وہ مقدور بھر کوشش کرے کہ اسلامی راج قائم ہو جائے اور دین کو دنیا پر تسلط مل جائے تا کہ لوگ اپنی دنیاوی زندگی کو دینی تعلیمات کے مطابق بسر کرتے ہوئے نجات آخروی وخوشنودی خدا تک پہنچ سکیں۔

مسلمانوں پر قیامت تک کے لئے خلیفہ کا منتخب کرنا جو خلافت کی تمام شرائط کا حامل ہو فرض کفایہ ہے اس کے لئے چند دلیلیں ہیں۔

پہلی دلیل: یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنحضرت ﷺ کی تجہیز وتکفین سے پہلے خلیفہ کے تعین وتقرر کی طرف متوجہ ہوئے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اگر صحابہ کو شریعت کی طرف سے خلیفہ مقرر کرنے کی فرضیت اور اس کے تقرر میں تاخیر کی ممانعت معلوم نہ ہوتی تو وہ حضرات ہرگز خلیفہ کے تقرر کو آنحضرت ﷺ کے دفن پر ترجیح نہ دیتے۔ یہ تقرر صرف صحابہ کے فعل کو ثابت نہیں کرتا بلکہ آنحضرت ﷺ سے دلیل شرعی کا (خاص اس مسئلے میں پایا جانا بھی اجمالاً) ثابت کرتا ہے

دوسری دلیل: یہ ہے کہ خود حدیث نبوی میں آیا ہے۔

''جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس کی گردن میں کسی خلیفہ کی بیعت کا رشتہ نہ ہو وہ جاہلیت کی سی موت مرا''۔

تیسری دلیل: یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جہاد، فیصلے، مقدمات، علوم دین کا احیاء، ارکان اسلام کا قیام نیز بلاد اسلامیہ کی کفار کے حملوں کی روک تھام کو فرض کفایہ قرار دیا ہے مگر یہ سب باتیں اپنی جگہ پر خلیفہ کے مقرر کئے بغیر ممکن نہیں ہیں۔ اور قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ فرض کفایہ کا حاصل ہونا جس چیز پر موقوف ہو وہ چیز بھی فرض کفایہ ہوتی ہے۔ بڑے بڑے صحابہ نے اس قاعدے سے امت کو آگاہ کیا ہے۔ (ازالۃ الخفاء، شاہ ولی اللہ، ترجمہ عبدالشکور، مطبوعہ کراچی صفحہ 30)

تحریک پاکستان یا قیام پاکستان کا مقصد بھی اسی خلافت کا قیام تھا۔ پاکستا کا مطلب کیا لا الہٰ الا اللہ کا نعرہ اپنے مفہوم و معانی کے لحاظ سے قیام خلافت کا اعلان کرتا ہے۔ ایک ایسی

ریاست کا قیام جس میں اسلام کو مرکزیت حاصل ہو، دین کی حکومت کا قیام ایک عملی صورت میں نظر آئے تا کہ دین اسلام کو اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ عملی زندگی میں نافذ کیا جا سکے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر قیام پاکستان کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ پاکستان کی اہمیت اس لئے نہیں کہ بیسویں صدی میں ایک نئی ریاست وجود میں آ گئی، بلکہ اس لئے ہے کہ یہ نئی ریاست ایک دینی ریاست ہے جو دین اسلام کی پابند ہے اور جو دین اسلام کے عملی نفاذ کیلئے ہی حاصل کی گئی۔

دین اسلام اس صالح زندگی کا نام ہے جو اللہ کے پیغمبروں کے ذریعے بنی نوع انسانیت کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ پیغمبروں نے اس میدان میں دو اہم کام سرانجام دیئے پہلا کام یہ ہے کہ وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے اس طریق زندگی اور ہدایت کا علم حاصل کیا اور دوسرے اس علم ہدایت کو اللہ کے بندوں تک پہنچایا اور صرف پہنچایا ہی نہیں بلکہ بتایا اور سکھایا بھی۔ خود ان تعلیمات پر عمل کیا اور لوگوں کو اس پر عمل کی تلقین کی۔

امت محمدیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت اور ان کی نیابت میں رسول اکرم ﷺ کے کار نبوت کو آگے بڑھانے کے لئے اللہ کی طرف سے چن لی گئی ہے۔ لہٰذا اب مسلمان ہونے کے ناطے ہر مسلمان اس بات کا پابند ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے مشن کو اور ان کی تعلیمات کو آگے بڑھائے کیونکہ آپ پر نبوت ختم ہو چکی ہے اور نبوت کے ختم ہونے کی وجہ سے ہی ہر مسلمان کو حضور ﷺ کی نیابت میں دین کی خدمت پر مامور کر دیا گیا ہے تا کہ آپ کا مشن قیامت تک کے لئے جاری رہے۔ حضور ﷺ کی پوری سیرت طیبہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں چار بنیادی کام سرانجام دیئے ہیں۔

1۔ آپ نے سب سے پہلے دین اسلام کے لئے لوگوں کو دعوت دی۔ دین کی تبلیغ کی۔ آپ نے تمام مشکل حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ انتہائی صبر و سکون کے ساتھ دین کی تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ ایک موقعہ پر آپ نے بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا تھا۔

''اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں تو میں خدا کی توحید بیان کرنے سے باز نہیں آؤں گا۔''

2۔ جب آپ کی دعوت پر کچھ لوگوں نے لبیک کہا تو ابتدائی تبلیغ کے سات ان اہل ایمان لوگوں

کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا نیز ان کی باطنی صفائی کے لئے تزکیہ نفس کا کام سرانجام دیا۔

3۔ پھر کچھ آگے بڑھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام میں مزید اضافہ کیا آپ کی مدینہ کی زندگی سے اس کام کا آغاز ہوا۔

4۔ چوتھا کام اس وقت شروع ہوا جب دین اسلام کے اس مشن کو مزید آگے بڑھانے کے لئے رشد وہدایت کے اس دین کی حفاظت کے لئے اور اللہ کے بندوں کو ایمان اور اعمال صالح کی دولت سے مالا مال کرنے کیلئے مخالف قوتوں سے تصادم ضروری ہو گیا کیونکہ وہ اللہ کے اس دین کو دنیا سے ختم کرنے کیلئے پورے وسائل کے ساتھ میدان عمل میں آ چکے تھے جبکہ آنحضرت ﷺ اس مہم کو نا کام بنانے کے لئے خدا کی طرف سے مامور تھے یوں حضور ﷺ کی سیرت میں جہاد کے کام کا اضافہ ہوا اور آپ کی زندگی کے آخری لمحے تک یہ جہاد جاری رہا۔ تمام صحابہ اس کام میں آپ کے ساتھ شامل رہے۔ دین کی نصرت اور دین کی خدمت کی مہم بڑی کامیابی کے ساتھ آپ کی زیر قیادت جاری رہی۔ صحابہ کی مقدس جماعت آپ کی زیر ہدایت اپنا کام سرانجام دیتی رہی آپ کے بعد یہ کام پوری امت محمدیہ کا فرض ہو گیا کیونکہ قرآن پاک میں اس کام کی ہدایت موجود ہے سورۃ حج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور جدوجہد کرو اللہ کی راہ میں اس کے دین کے راستے میں جیسی جدوجہد کا حق ہے اے امت محمدیہ اللہ نے تم کو اس خدمت کیلئے چنا ہے''

اسی طرح سورۃ الصفّ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اے ایمان والو! کیا تمہیں ایک ایسا کاروبار بتادوں جو دردناک عذاب سے تمہیں نجات دلادے سنو! وہ یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس ایمان کے مطالبوں کو ادا کر کے اپنے حقیقی مومن ہونے کا ثبوت دو اور اپنے جان و مال سے اللہ کے رستے میں دین کے لئے جدوجہد کرو ، یہ تمہارے لئے سراسر خیر ہے۔''

ان آیات میں صاف صاف مسلمانوں کو اللہ کے دین کی نصرت اور خدمت کا حکم دیا گیا ہے۔ اہل ایمان کو اللہ کے مددگار کا اعزاز دیا گیا ہے۔ ان آیات میں جہاد بالسیف کے لئے ہی

نہیں بلکہ دین کی دعوت، دین
کی ترغیب، دین کی کوشش، تزکیہ نفس، اصلاح وارشاد کا حکم بھی اس کے ساتھ ہی ہے۔

سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے۔

''اور ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے اور نیکی کے لئے لوگوں کو کہے اور برائی سے منع کرے۔''

حدیث پاک میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا!

''تم میں سے جو شخص برا عمل ہوتا دیکھے (اگر اپنی طاقت وقوت سے اس برائی کو روک سکتا ہو) تو وہ اپنی طاقت سے روکے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے کوشش کرے اور اگر یہ بھی نہ سکتا ہو تو پھر دل میں ہی اسے برا خیال کرے اور یہ صورت ایمان کی انتہائی کمزور ہو گی۔'' (رواہ مسلم کتاب ایمان 78 کتاب علم 28 بخاری شریف)۔

حضرت جریر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا!

''جو شخص کسی قوم میں رہتا ہو اور ان کے اندر رہ کر اللہ کی نافرمانیاں کرتا ہو اور وہ لوگ اس کے طرز عمل کے بدلنے کی قدرت رکھتے ہوں لیکن اس کے باوجود نہ بدلیں تو اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے دنیا میں ہی ان کو اپنے عذاب میں مبتلا کر دے گا۔'' (روایت ابوداؤد وابن ماجہ)

مندرجہ بالا دینی احکامات کے بعد مسلمانوں پر ان ذمہ داریوں کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے جو بطور حضور ﷺ کے امتی ان پر عائد ہوتی ہے۔ ان ذمہ داریوں کو اس وقت تک احسن طور پر پورا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ خلافت اسلامیہ قائم نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا قیام مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے اس وقت دنیا کے اندر یوں تو کئی مسلم ریاستیں موجود ہیں لیکن کسی مسلم ریاست کے پیش نظر کیا وہ مقاصد ہیں جو حضور اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں اپنے پیش نظر رکھے، اور جن کو پورا کرنا مسلمانوں کو بطور امتی ورثے میں ملے ہیں؟ جبکہ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ مسلم اکثریت کی حکومت، حکومت الٰہیہ یا خلافت الٰہیہ کا نعم البدل نہیں ہے۔

مولانا ظفر الدین نے اپنی کتاب ''اسلام کا تصور امن'' میں دو قسم کی حکومتوں کا ذکر کیا ہے

''ایک انسانی حکومت ایک ربانی حکومت، انسانی حکومت وہ ہے جس میں انسانوں کا

خود ساختہ قانون نافذ ہوتا ہے جو خامیوں اور کمزوریوں سے پاک نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ انسانوں کی وہ جماعت جو انسانی قانون وضع کرتی ہے۔ سارے انسانوں کے جذبات میلانات سے واقف نہیں ہوسکتی اور نہ ہی قانون بنانے والے افراد تمام تر انسانی خیالات واحساسات پر قدرت رکھتے ہیں۔ پھر انسان ہونے کی حیثیت سے قانون بنانے والوں کے اپنے ذاتی نظریات ورجحانات بھی ہیں جن کی رعایت ایک فطری عمل ہے اور یہ رعایت معاشرے میں نفاق اور، بے انصافی کا باعث بھی بن سکتی ہے اس لئے جو قانون انسانوں کی جماعت وضع کرتی ہے یہ دنیاوی قانون ہیں جو دنیاوی حکومتوں کے کام آتے ہیں ان میں نہ تو پورا انصاف ہوتا ہے اور نہ ہی ایسے قوانین کی مدد سے آپ ظلم وستم کے دروازے بند کر سکتے ہیں۔ البتہ ایک طبقہ ہمیشہ ظلم وستم برداشت کرتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ مرنے کی زندگی بسر کرتا ہے کوئی حاکم ہے تو کوئی محکوم، حاکم ومحکوم کا فرق کبھی قوم ونسل کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے تو کبھی سرمایہ داری اور غربت کے نام پر کبھی کبھی یہ فرق مذہب کا روپ بھی دھار کر گل کھلاتا ہے کبھی یہ کھیل جمہوریت واشتراکیت کے نام پر کھیلا جاتا ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اشتراکیت ہو یا جمہوریت دونوں میں حاکم ومحکوم کے طبقے قائم رہتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں دوسرا قانون حکومت، قانون ربانی ہے جسے دینی حکومت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ قانون کسی مخصوص انسان یا انسانی پارٹی کا بنایا ہوا نہیں ہوتا بلکہ یہ سارا قانون اس احکم الحاکمین کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ جس نے ساری کائنات پیدا کی جو تمام انسانوں کا خالق ومالک ہے اللہ تعالیٰ چونکہ تمام عالم اور تمام تر کائنات پر محیط ہے کوئی ذرہ اس کے علم سے باہر نہیں وہ انسان سے لے کر ایک ایک ذرے کی پوری طرح خبر رکھتا ہے لہٰذا اس کا قانون سب کے مزاج اور ساری کائنات کے حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں ایک ایک چیز اور ایک ایک آدمی کا پورا پورا لحاظ ہوتا ہے۔ اور یقینی طور پر سب کے موافق ہوتا ہے۔''

پس حضور ﷺ کی قیادت میں ان کی نیابت کو برقرار رکھنے کے لئے انسانی حکومت کی ضرورت نہیں بلکہ ربانی حکومت کی ضرورت ہے۔ جس کی نشاندہی مولانا نے اپنی تحریر میں کردی ہے اور پاکستان ایسی ہی حکومت قائم کرنے کے لئے وجود میں آیا۔

قیام پاکستانی کے دوران جو کچھ ہوا وہ تاریخ انسانیت میں ایک عظیم سانحہ کی حیثیت

اختیار کر چکا ہے اتنی بڑی جانی و مالی قربانی شاید ہی کسی ریاست کے قیام کے لئے کسی قوم کے افراد نے دی ہو، کیا یہ قربانیاں محض محلات کی تعمیر کرنے کے لئے تھیں یا اس لئے کہ چند لوگ ہیرا پھیری سے جمہوریت کے نام پر غریب عوام کو دھوکا دے کر ہر بار مسند اقتدار پر قبضہ کر کے اپنی من مانیاں کرتے ہوئے غریب عوام کے افلاس پر اپنی خواہشات کا تاج محل تعمیر کرتے رہیں۔ اگر ایسا ہے تو اسلام کے نام پر اتنا بڑا دھوکا ہے جو کبھی کسی مسلم ریاست نے مسلمانوں کو نہیں دیا اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ تقریباً ساٹھ سال سے مسلمان، مسلمانوں سے خلافت کے قیام کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ جبکہ خلافت کا قیام دین اسلام کا ایک بنیادی تقاضہ ہے۔

جس صبح کا وعدہ تھا اس دیس کے لوگوں سے
اے کاش کبھی خالد وہ بھی تو سحر آئے

مرسلہ انور سعید

(بشکریہ ماہنامہ الاحرار لاہور اپریل 06ء)

اسلام میں معلّم کا کردار

عتیق الرحمٰن صدیقی

علم وآگہی کی اہمیت وافادیت سے ناشنا اور محروم معاشرہ بے شمار رذائل ومفاسد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔مختلف النوع مصیبتوں اور آفتوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے، بگاڑ وفساد انتہاؤں کو چھونے لگتا ہے،انتشار وخلفشار اور عداوت ومنافرت کی سمیت اورزہرناکی سے فضائیں مسموم ہو جاتی ہیں ، مؤدت ومؤانست کی بوباس باقی نہیں رہتی،حقوق وفرائض کے مابین ربط وارتباط ڈھیلا پڑ جاتا ہے،معاشرہ کے افراد تعصّبات کے تنگ دوائر میں محبوس ہونے کے باوجود اپنی جاہلانہ روش پر قائم رہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔کسی ہادی،معلم اور مصلح کی دعوت بھی انہیں چونکا دینے سے قاصر رہتی ہے اور وہ اپنی جہالت پر دل گرفتہ نہیں ہوتے بلکہ مختلف توجیہوں سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔ذرا ملاحظہ کیجئے قرآنی آیات کی روشنی میں مکہ کے مشرکین، مدینہ کے یہود ومنافقین اور دوسرے اعدائے دین کا طرزِعمل:

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَo اَلَا اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ (البقرہ12-11)۔

ترجمہ:''جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں۔''

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا کَمَا اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْا اَنُؤْمِنُ کَمَا اٰمَنَ السُّفَھَاءُ اَلَا اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَاءُ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ۔(البقرہ-13)

''اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لے آؤ تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟ خبردار حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں مگر جانتے نہیں ہیں (یعنی علم سے تہی ہیں)''۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ثَانِیَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔(الحج8-9)

''بعض لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں تا کہ لوگوں کو راہ خدا سے بھٹکا دیں''۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا۔(لقمٰن6)

''اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے تا کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے''۔

سورۃ التوبۃ میں دیہاتی اور صحرائی عربوں کے بارے میں کہا گیا:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ۔(التوبۃ8-9)

''یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کی حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔''

علم دراصل روشنی ہے اور جہالت اندھیرا ہے۔ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بات بنتی نہیں بلکہ بگڑ جاتی ہے جب تک کہ کوئی بندۂ حق اندیش ''العلم'' کی قندیل روشن نہ کرے اور نظام حق کو بگاڑنے کی کوششوں کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔ اوپر کی ان آیتوں میں جہالت کی

مختلف جہتوں کو مبرہن کیا گیا ہے۔قرآن کہتا ہے!

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (البقرۃ257)

''جولوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے، وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔اور جولوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں، وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لاتے ہیں۔''

اللہ ﷻ نے خود اپنی کتاب کو''نور مبین'' کے نام سے موسوم کیا۔اس نور سے منور ہوئے بغیر یہ ممکن نہیں کہ اللہ کا نائب یعنی خلیفۃ اللہ اپنے منصب کے تقاضے پورے کر سکے۔اس لئے ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ علم حاصل کرے۔طلب علم کے لئے سفر کو عبادت سے، اس راہ میں موت کو شہادت سے اور علمی تحقیق میں بحث وکلام کو جہاد سے تعبیر کیا گیا۔ ہر لحظہ تدبر، تفکر اور سوجھ بوجھ سے کام لینے پر زور دیا گیا۔کہا گیا کہ مہد سے لحد تک علم کی طلب اور جستجو میں رہو۔

اوّلین انسان اور سلسلہ نبوت کے بانی حضرت آدم علیہ السلام تھے۔آپ کی خلافت کا ذکر علم کے ساتھ ہوا۔معلم حقیقی نے انہیں تمام نام سکھا دیئے! وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو معلّمی کے منصب جلیلہ پر متمکن کر دیا گیا اور کہا گیا کہ ہدایت کا چلن عام کریں۔اور پھر اس سلسلے کا اختتام حضور نبی کریم ﷺ پر جس اولین وحی سے ہوا وہ بھی علم اور قلم سے متعلق تھی

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔(العلق)

''پڑھو(اے نبی!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، اور انسان کو وہ علم دیا جو وہ جانتا تک نہ تھا''۔

اللہ ﷻ نے انبیاء کرام علیہم السلام اور بالخصوص نبی محترم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے انسانوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام فرمایا اور تمام نبیوں اور رسولوں کو ایک نہایت احسن معیار کا کامل اور بہترین نمونہ بنایا حقیقت میں ہر نبی انسانیت کا معلم تھا، انسانیت کی صلاح وفلاح اور نشوارتقاء کا ہر پہلو اس کے پیش نظر تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا!

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً (سنن ابن ماجہ، المقدمۃ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم)

یعنی ''میں معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔

مکارم اخلاق کی تکمیل اور حسنِ اخلاق کا اتمام اپنی بعثت کا مقصد بتایا!

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَ خْلَاق (مجمع الزوائد للہیثمی 18/9۔ ومختصر المقاصد للزرقانی 184)

اور بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَ خْلَاق (موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب انہ قد بلغہ رسول اللہ ﷺ قال بعثت لاتمم حسن الاخلاق) اور اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ صَالِحَ الْاَ خْلَاقِ (مسند احمد 8595۔ ومجمع الزوائد للہیثمی 18/9)

یعنی مجھے اس لئے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں زندگی کے تمام تر شعبوں کو جادۂ مستقیم پر گامزن کردوں۔ آپؐ نے ایک طرف تو معلم کو مدارج اخلاق کا مخزن بتایا تا کہ وہ ضوفشاں ہو کر روشنی بکھیرے اور دوسری طرف اہل علم کو انبیاء کرام کے وارث قرار دیا!

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَا رًا وَلَا دِرْهَماً اِنَّمَا وَرَّثُوْا الْعِلْمَ (سنن الترمذی، کتاب العلم عن رسول اللہ ﷺ باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ)

''بے شک اہل علم انبیاء کے وارث ہیں، اور انبیاء دینار و درہم وراثت میں نہیں چھوڑتے، بلکہ ان کی وراثت علم ہے'' وہ اپنے پیروکاروں کو اسی کا امین بناتے ہیں''۔

معلوم ہوا کہ وہ لوگوں سے کسی اجر کے طالب نہیں ہوتے، ان کا مشن طلب اور تحریص سے بالاتر ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام جو دراصل اللہ کی طرف سے معلم بنا کر بھیجے گئے ہوتے ہیں، ان کا رول ذیل کی آیات میں ملاحظہ فرمایئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کعبہ کی دیواریں کھڑی کرتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوتے ہیں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (البقرۃ129)

''اے ہمارے رب! ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ یقیناً تو بڑا مقتدر (اور) حکیم ہے۔''

اللہ ﷻ نے باپ بیٹے کی یہ دعا قبول فرمائی اور سورۃ البقرۃ ہی میں ارشاد ہوا!

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (151)

''جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے، تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

سورۂ آل عمران میں بعثتِ محمدی کو اہل ایمان پر اپنا احسان عظیم قرار دیتے ہوئے فرمایا!

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران146)

,,درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔''

ان تمام تر آیات میں رسول اللہ ﷺ کی منصبی ذمہ داریاں گنوائی گئی ہیں' یعنی تلاوت آیات' تعلیم کتاب' تعلیم حکمت اور تزکیہ نفوس ——— یہ چار اہم کردار بھی ہیں اور اپنا مضمون پیش کرنے کے لئے چار اہم اقدامات بھی۔ یعنی یہاں پر قاری' معلم' مربی ومزکی اور صاحب حکمت کے طور پر حضور نبی کریم ﷺ کو پیش کیا گیا ہے۔

(ا) یتلو، تلاوت سے مشتق ہے اور تلاوت کے اصل معنی اتباع اور پیروی کے ہوتے ہیں۔ یعنی معلم کتاب کے متن کو صحت تلفظ کے ساتھ، ٹھراؤ کے ساتھ اور مناسب رفتار سے پڑھ کر سنائے اور سامعین یعنی تلامذہ قراءتِ معلم کی ہو بہو پیروی کریں۔

(ب) متن کی توضیح وتشریح کی جائے، جو معانی مضمر ہوں انہیں کھولا جائے، سوالات کے جوابات دیئے جائیں، مخاطبین کو پوری طرح مطمئن کیا جائے اور ہر پہلو کو واضح کیا جائے۔

(ج) حکمت کی تعلیم کا طریقہ عقلوں کی تربیت اور کردار کی تعمیر ہے، کسی کو حکمت منتقل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بکثرت مشق کرائی جائے، فہم کے لئے روشنی مہیا کی جائے اور غور اور تعقل وتدبر کی عادت ڈالی جائے۔ حضور نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجالس میں ایسے سوالات کرتے جن سے وہ سوچنے پر مجبور ہوں اور ان میں قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ آپؐ نے کئی چیزوں کی حکمت تمثیلات کی مدد سے سمجھائی۔

(د) تلاوت آیات، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کا اصل مقصود تزکیہ نفوس ہے، یعنی افراد معاشرہ کو فکری اور عملی طور پر سنوارنا اور نکھارنا انبیاء کی جدوجہد کا اصل ہدف ہر انسان اور ہر معاشرہ کا تزکیہ ہے تزکیہ کا مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشوونما دینا اور اس کو پروان چڑھانا ہے نفس کے اندر جو غلط افکار ونظریات جڑ پکڑ گئے ہوں ان کی جڑیں اکھاڑنا، عادت واخلاق کی ناہمواریوں اور کمزوریوں کو دور کرنا اور نیکی کو بدی پر غالب کر کے ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کرنا ہے۔

قرآن حکیم نے دوسرے مقام پر رسول اللہ ﷺ کو شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ اور سراج منیر ایسے ناموں سے موسوم کیا، فرمایا!

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا (الاحزاب 46)

''اے نبی! ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر''۔

آپ ﷺ جن وانس کے لئے رحمت کا پیام لے کر تشریف لائے تھے، یہ دعوت بنی نوع انسان کے لئے رحمت تھی۔ آپؐ کی اس دعوت سے دنیا کی شقاوت وحرمانی کا موسم بدل گیا، ظلم و

طغیان اور فساد وعصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں خدا اور اس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔ قرآن نے کہا!

الٓرٰ کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ(ابراهيم)

''الف، لام، را (اے محمد ﷺ!) یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ ان کے رب کی توفیق سے اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔''

ان آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے یہ اسلامی نظام تعلیم کے ترکیبی عناصر بھی ہیں اور معلم کے کردار کی مختلف جہتیں بھی۔ تبشیر و تنذیر اور شہادت ایک داعی کے مختلف رویے بھی ہیں جو وہ مختلف مراحل میں موقع و محل کی مناسبت سے اختیار کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے عہد مسعود میں اور صحابہ ؓ نے خلافت راشدہ کے دور میں جو نظام تعلیم رائج کیا اس کے خال و خد میں علم و عمل کی وحدت و یکجائی بھی ہے، معلم و متعلّم کے مابین گہری رفاقت بھی ہے، مفت تعلیم بھی ہے، یکساں نصاب بھی ہے، حریت فکر بھی ہے، بے خوف و خطر رائے کی آزادی بھی ہے اور تعلیم و تربیت کے اس نظام میں ہر لحظہ اخلاق حسنہ کی روح بھی کارفرما ہے اور تعلیم پر کسی خاص گروہ کا اجارہ بھی نہیں اور معلم کے علوم مرتبت کا پورا لحاظ بھی موجود ہے۔ آپ ﷺ کی معلّمانہ حکمت عملی میں تنظیم و تنسیق بھی ہے، تنوع بھی ہے، مکالماتی انداز بھی ہے اور تقریری و تحریری بھی، انفرادی طور پر بھی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اور اجتماعی طور پر بھی خیر و بھلائی کی جانب راغب کرنے اور منکرات سے روکنے کا عمل بھی ہے۔ نامساعد حالات میں صبر و مصابرت کی کیفیت موجود رہتی ہے، یاس و نومیدی کا کوئی گزر نہیں، بلکہ ہر ساعت رجائیت کا چلن ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس تمام تر جد و جہد میں استاد کا مقام سب سے زیادہ اہم ہے اس کی حیثیت مرکز و محور کی سی ہے، وہ صرف پیغام رساں نہیں، اس کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ تلامذہ کو معلومات فراہم کرے، وہ تعلیم کے اصل مقصد کو ہدف بنا کر آگے بڑھنے پر مامور ہے۔ تعلیم ایک ایسا عمل ہے کہ جس کے ذریعے ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے اور تعلیم اس قوم کو تشکیل دینے

والے افراد کے احساس وشعور کونکھارنے کا مفید وسیلہ بناتی ہے۔تعلیم زندگی کے مقاصد وفرائض کا احساس پیدا کرتی ہے۔تعلیم ہی سے ایک قوم اپنے ثقافتی، مذہبی اور ذہنی ورثے کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرتی رہتی ہے۔اور اسلامی تعلیم وہ ہے جو انسان کو ہدایت الٰہی کی روشنی میں ذہنی، جسمانی اور طبعی قوتوں کے ذریعے مادی کائنات میں اس طرح تصرف کے قابل ہوتی ہے کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کا فروغ، رضائے الٰہی کے حصول کا وسیلہ بنے اور بالآخر اُخروی فوز وفلاح حاصل ہو جائے۔ 1977ء میں مکہ مکرمہ میں اسلامی تعلیم پر ہونے والی عالمی کانفرنس میں تعلیم کا جو مقصد طے کیا گیا تھا اگر اس پر بھی نظر دوڑائی جائے تو بات زیادہ مبرہن ہو جائے گی۔

> ''تعلیم کا مقصد انسانی روح، ذہانت، استدلال، محسوسات اور حسیاتی قوتوں کے ذریعے انسان کی مکمل اور متوازن نشو ونما ہے۔ چنانچہ تعلیم کو انسانی شخصیت کے روحانی، ذہنی، تصوراتی، طبعی، سائنسی اور لسانی پہلوؤں کی انفرادی اور اجتماع سطح پر نشو ونما کے لئے فکری غذا فراہم کرنی چاہئے تا کہ وہ نیکی کے رخ پر ڈھل سکیں اور اس طرح انسان کی شخصیت کی تکمیل ہو سکے۔''

فکری اور ثقافتی ورثہ کے انتقال کے لئے رسمی طریقہ ہی زیادہ موزوں، منضبط، مربوط اور مؤثر ہوتا ہے اور اس کا مرکز تعلیمی درسگاہ اور ادارہ ہی ہے جس کا والی ووارث اور مرکزی کردار صرف استاد ہے۔ استاد ہی اپنے انقلابی عمل سے اسے تب وتاب عطا کر سکتا ہے۔ وہ فراہمی معلومات تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتا، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ ایسے طلبہ تیار کرتا ہے جو دنیا بھر کی قیادت کریں، وہ احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے عملی جدوجہد کرتا ہے اور تعلیمی ادارے کے پورے ماحول کو اسلامی رُخ پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ طلبہ کی علمی قیادت اس طرح کرتا ہے کہ وہ تمام علوم اور نظریات کی اسلام کے نقطہ نظر سے چھان پھٹک کر سکیں۔ اس کی تدریس اثر انگیز ہوتی ہے اور وہ تمام ضروری نکات کی تصریح وتوضیح کرتا ہے، سوال وجواب کا انداز اپناتا ہے، اس کا شخصی رویہ مؤثر ہوتا ہے، وہ سیرت و کردار، علمی فضیلت اور ابلاغ میں ایک روشن مثال ہوتا ہے، وہ مطالعہ وتحقیق کا ذوق رکھتا ہے اور اپنے طلبہ میں اس ذوق کو ابھارتا ہے۔ وہ مطالعہ کا شوقین ہوتا ہے اور شاگردوں کی تشویق میں بھی

اضافہ کرتا ہے۔ وہ ممتحن کی حیثیت سے ایک معروضی معیار پیش نظر رکھتا ہے اور دیانت وامانت کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔

معروف دانشور خرم جاہ مراد کے خیال میں استاد کے لئے چار میدان ہیں، اس کو اپنا مقام پہچاننا ہے اور اپنا کام کرنا ہے۔ ایک اس کی اپنی ذات ہے، ایک اس کا اپنا علم ہے، ایک اس کا شاگرد ہے اور ایک اس کی تعلیم کا عمل ہے ــــــــــــ اس کا پہلا کام خود اپنی صورت گری ہے، اپنی ذات کی تشکیل ہے، اپنی خودی کی تعمیر ہے، اپنی صلاحیتوں کا نشوارتقاء ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اپنے آپ کو ایک اہم مقصد کے لئے وقف نہ کرے۔ مقصد سے لگن بھی ہو اور عشق بھی۔ اور یہ مقصد دین حق کو ادیان باطلہ پر غالب کرنا اور ایک صاف ستھری سوسائٹی کا قیام ہے۔ دوسرا اعلیٰ علمی معیار کا حصول اور تخلیقی صلاحیتوں کی نمو، نقد وانتقاد اور جدت فکر کی صلاحیت سے بہرہ ور ہونا ہے، اسلامی نظام تعلیم کو بروئے کار لانے کے لئے نصابی کتب کی تیاری بھی ہے۔ شاگرد سے ایسا تعلق جو اس کی شخصیت وکردار پر اسلامی نقوش مرتسم کر سکے، ایسا نہ ہو کہ علم صرف تلاش معاش اور تن آسانی کا ذریعہ بن جائے۔ معلم کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر قوتیں اور صلاحیتیں اسلام کے احیاء کے لئے وقف کر دے اور اپنے ادارے میں اس مقصد عظیم کے لئے ایک فعال ستون بن کر کھڑا ہو جائے۔

عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کے لئے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تعمیر اور تشکیل نو اسلام کے مطابق کرے۔ ظاہر ہے اس جہد وسعی کا اہم ترین محاذ نظام تعلیم کا میدان ہے اور اس میدان میں استاد کا رول ہی سب سے اہم ہے۔ وہ معاشی محرومیوں اور معاشرتی الجھنوں کے باعث ذہنی وفکری افلاس میں مبتلا ضرور ہے۔ مگر اپنے من میں ڈوب کر اپنا سراغ پانے کی کوشش کرے، اللہ سے سنبھلنے کی توفیق طلب کرے اور اپنے جلو میں برق وشرر کی خلش ن لے کر تعلیمی ماحول کو صبح نو سے ہمکنار کرنے میں جت جائے تو یقیناً فوز وفلاح اس کا مقصد ہو گی۔ اقبال نے کہا تھا!

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دل خود زندہ دار
تا نہ گردد خاکِ تو مثلِ مزار

''زندگی کا راز جستجو میں مخفی ہے اس کی حیثیت اور بنیاد آرزو میں پوشیدہ ہے آرزو کو اپنے دل میں زندہ رکھ تا کہ جس مٹی سے تو بنا ہے وہ مزار بن کر نہ رہ جائے۔''

اخذ و استفادہ

1۔ حضور اکرم ﷺ کے قائم کردہ نظام تعلیم و تربیت کی روح، از محمد صلاح الدین

2۔ احیائے اسلام اور معلم، از خرم جاہ مراد

3۔ تعلیم اور سیرت سازی، محمد اسلم سلیمی

4۔ معلم معمار قلب و نظر، ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی

5۔ تفہیم القرآن، جلد اوّل، دوم، پنجم، از سید مودودی

6۔ حیات رسول اُمی ﷺ از خالد مسعود

(ماخوذ از ماہنامہ میثاق لاہور جولائی 08)

پاک سرزمین ـــــ ایک منفرد خطۂ زمین

انجینئر مختار فاروقی

یروشلم کی وادیٔ قدس کی طرح سرزمینِ حجاز کی وادیٔ فاران اور وادیٔ بطحا کے پہاڑ اور ریگ زار اپنے اندر اہل حق کی لازوال داستانوں کے بے شمار انمٹ نقوش رکھتے ہیں۔ امت مسلمہ کا ہر فرد مکہ کی اس وادی کے بارے میں اپنے دل و دماغ میں کئی ''تاج محل'' سجائے رکھتا ہے اور مکہ حاضری کو ہر مسلمان باعث سعادتِ دارین سمجھتا ہے اور ـــــــــــ بجا طور پر یہ بات باعث فخر و مباہات ہے۔

آج سے ایک صدی پہلے تک دور دراز علاقوں سے مکہ جانا اور حج و عمرہ کی سعادت حاصل کرنا ایک جان جوکھوں کا کام تھا اور جو انسان اس راہ پر نکلتا تھا اس کا اس بابرکت سفر سے واپس گھر صحیح سلامت پہنچ جانا اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہوتا تھا۔ فاصلے زیادہ، ذرائع آمد و رفت محدود، راستے پُر خار و پُر پیچ اور ملکی و سیاسی حالات میں جنگ و امن کی کیفیت بہت غیر یقینی ہوتی تھی۔

تاہم ـــــــــــ اب گذشتہ تین چار دہائیوں سے سفر بہت آرام دہ ہو گیا ہے۔ اور ہوائی سفر نے تو وقت کو بہت ہی کم کر دیا ہے اور سہولتوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ مزید برآں ـــــــــــ گھر سے نکل کر حرم پہنچ جانا اور وہاں کی برکتوں کے ساتھ ساتھ ان گنت نعمتوں سے فائدہ اٹھانا اب ہر آسودہ مسلمان کے لئے ممکن بھی ہو گیا ہے۔

مکہ جا کر ـــــــــــ پھر مدینۃ النبی ﷺ میں مسجد نبوی علی صاحبہا کی زیارت اور منبر رسول ﷺ اور آپ کی قبر کے درمیان ''جنت'' کے ٹکڑے میں وقت گذارنا کسی بھی بڑی سے بڑی ممکنہ دنیاوی نعمت سے بڑی نعمت و سعادت ہوتی ہے۔

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ رَسُوْلِكَ وَصَلِّ عَلَی
الْمؤْ مِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

بقول شاعر

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نقش گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

حج اور عمرہ کی سعادت حاصل کرنے والے جانتے ہیں کہ بیت اللہ شریف کی زیارت اور طواف کتنی بڑی سعادت ہے اور اس سے ہر انسان کو کتنا سکون میسر آتا ہے زمین کے اس ٹکڑے پر قدم قدم پر ان گنت یادگاریں اور قابل غور ''آیات الٰہی'' ہیں جن پر انسان کو توجہ ہو جائے تو لازمًا غور وفکر کرنا چاہیے۔

بیت اللہ شریف کی وہ دیوار جو 'حجر اسود' والے کونے سے شروع ہو کر رکن عراقی تک جاتی ہے اور جس طرف بیت اللہ شریف کا دروازہ بھی ہے وہ پوری دیوار ''ملتزم'' کہلاتی ہے۔ اور رسالت مآب حضرت محمد ﷺ نے اس کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے اور یہاں چمٹ چمٹ کر دُعائیں کرنا ہر مسلمان کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے اور یہاں دُعائیں قبول ہوتی ہیں اگر چہ ان دُعائیں کی قبولیت کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں جن میں اکل حلال سب سے اول اور بڑی شرط ہے تاہم مجموعی طور پر ملتزم قبولیت دُعا کا مقام ہے اسی کے قریب مقام ابراہیم علیہ السلام ہے اور چاہ زمزم کی جگہ ہے اگر چہ اب چاہ زمزم UNDER GROUND ہے اور کچھ فاصلے پر موجود راستے کے ذریعے وہاں تک ہر شخص جا سکتا ہے۔

اس ملتزم کے سامنے والا سارا علاقہ بہت اہم اور خوش قسمت ہے۔

نیز بیت اللہ شریف پوری دنیا کے مسلمانوں کا قبلہ ہے اور ہر چہار طرف سے اس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کی جا رہیں ہیں۔ نقشہ کے اعتبار سے بیت اللہ شریف کے مشرق،

مغرب، شمال اور جنوب میں جو اہم بابرکت شعائر آتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔

شمال مشرق	مقام ابراہیم، چاہ زمزم، کعبہ کا دروازہ، ملتزم
جنوب مشرق	.....
شمال مغرب	حطیم
جنوب مغرب	رکن یمانی

عین شمال کی طرف رکن یمانی ہے

مضمون کی وضاحت کے لئے بیت اللہ شریف کی تصاویر اور نقشہ

کعبہ کے حجر اسود والے کونے سے مشرق کی طرف کوہ صفا ہے جہاں سے ''سعی'' شروع کی جاتی ہے اور اسی لکیر سے طواف کا آغاز اور اختتام ہوتا ہے۔

بات مکۃ المکرّمہ کی ہو یا مدینۃ المنورہ کی، جو شخص ایک دفعہ وہاں سے ہو آیا ہے وہاں

کے حالات کا تذکرہ کرنے سے اس کا دل مچل جاتا ہے اکثر بے تاب ہو کر انسان کے آنسو نکل آتے ہیں اور وہاں گزارے ہوئے یادگار لمحات انسان کو حضرت جامی علیہ الرحمۃ کے الفاظ

مشرف گرچہ شد جامی زلطفش
خدایا ایں کرم بار دگرکن

تصورات کی دنیا میں سہی، دامن کھینچ کر وہاں پہنچا دیتے ہیں ایسے قارئین یقیناً ان سطور کو پڑھتے ہوئے یہی محسوس کر رہے ہوں گے۔ بات ہو رہی تھی__________ بیت اللہ شریف کی اس مبارک دیوار کی جس کو ''ملتزم'' کہا جاتا ہے اور جو کعبۃ اللہ کے اطراف میں سے سب سے بابرکت متصور ہوتی ہے۔

دنیا اسلام کے وہ علاقے جو ملتزم کی طرف ہیں اور جب نماز میں قبلہ رو ہوتے ہیں تو وہاں کے مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر ملتزم کے سامنے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ''دل زندہ'' اور ''دل بینا'' عطا کرے تو اس سعادت بھری نمازوں اور دُعاؤں کے کیا کہنے__________ بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ۔ ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

مدینۃ النبی ﷺ اسی ملتزم والی طرف ہے جبکہ جنوبی ایشیا کا مسلم اکثریت کا علاقہ جو 1258ء میں عربوں کے زوال کے بعد اسلام کے دامن میں آیا جسے آج ہم پاکستان کے نام سے جانتے ہیں یہ علاقہ بشمول شمالی علاقہ جات اور افغانستان کے، اسی ملتزم والی طرف واقع ہے۔ پاکستان کا وسطی علاقہ تو عین کعبے کے دروازے کے سامنے واقع ہوا ہے یہاں کے لوگ جب نماز میں سجدہ ریز ہوتے ہیں تو عین کعبے کے دروازے کے سامنے سر رکھتے ہیں۔ اس پاک سرزمین کی یہ خوش بختی اور مسلمانان پاکستان کی بلند نصیبی ایسی سعادت ہے کہ جس میں یورپ و امریکہ اور افریقہ کے مسلمان شریک و سہیم نہیں ہو سکتے۔ یقیناً ۔ ع ''ایں سعادت بزور بازو نیست''

اس سعادت اور بے منت عطا کا تقاضا یہ ہے کہ ہم نماز میں محسوس کریں کہ ہم عین کعبہ کے دروازہ کے سامنے کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں اور ہم ملتزم میں ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہیں۔ آج اس سرزمین کا کیا حال ہے؟ عالمی سازشوں کے نرغے میں ہے دشمن ہمارے علاقوں پر بمباری کر رہے ہیں۔ ہم خود دین محمدی سے دور سودی معیشت، جاگیرداری اور بے حیائی واباحیت پرستی کا شکار ہیں۔ اس سعادت کی بنا پر عملاً ہم پر واجب ہے کہ ہم کھڑے ہو جائیں اور یہود و ہنود کی سازشوں کے خلاف ڈٹ جائیں اور ہمت کر کے پاکستان کو اسلام کا قلعہ اور گہوارہ

بنادیں اور اسلام دشمن قوتوں سے اس سرزمین کو پاک کرنے کا عہد کریں اور اس کے لئے اپنا سب کچھ لٹانے کا عزم مصمم کرلیں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی نگاہِ لطف وکرم ہماری طرف کردے۔

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

اسلام کے ابتدائی عروج کے دور میں مدینۃ النبی ﷺ کے بعد عراق، ایران، افغانستان اس ملتزم والی طرف واقع ہونے والے ممالک ہیں۔ جبکہ ــــــــــــ عربوں کے زوال 1258ء کے بعد جو علاقے مستقل طور پر اسلام کے زیر حکومت آئے ان میں پاکستان، مسلم انڈیا کا شمالی حصہ اور روسی ریاستیں وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب علاقوں میں پاکستان اپنی تاریخ، جغرافیہ، دوقومی نظریہ کی جدوجہد اور قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، شہدائے بالاکوٹ، شاہ ولی اللہ، شیخ عبدالحق، اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی محنتوں کی امین سرزمین ہونے کے ناطے اہم بھی ہے اور اسلام کے نام پر بننے والے ملک کے لحاظ سے منفرد بھی کہ یہ ملک عین ملتزم کے سامنے واقع ہے۔ پاکستان کا یہ خطہ زمین جسے بے پناہ قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا اللہ نے اس کا وقوع بڑا منفرد اور بابرکت بنایا ہے اور دنیا جانتی اور مانتی ہے کہ اسلام کے نفاذ کے امکانات کے حوالے سے پاکستان کا ہی علاقہ دنیا بھر کے ممالک میں سرفہرست ہے۔ کاش مسلمانانِ پاکستان اپنی قسمت کی اس بلندی کے باعث اپنے دینی تقاضے ادا کرنے میں بھی سرفہرست ہوجائیں! تو کیا کہنے۔

اس سعادت اور نعمت غیر مترقبہ پر آپ جتنا غور کریں گے آپ پر اللہ تعالیٰ کے احکامات اور انعامات کی قدر و قیمت کھلتی چلی جائے گی اور آپ کا دل اللہ کے احسانات کے احساس سے نرم ہوجائے گا اور اللہ کا بندہ اور محمد ﷺ کا غلام بن کر زندگی بسر کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔

آئندہ اپنی نمازوں میں ذرا چشم تصور سے محسوس کیجیے کہ میں عین کعبے کے دروازے کے سامنے سجدہ ریز ہوں، دل پر خاص انوار کا نزول ہوگا ان شاء اللہ۔

5

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

انجینئر مختار فاروقی

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جو عوام میں ''پیرانِ پیر'' کے نام سے مشہور ہیں آپ کی ولادت 1077ء/470ھ میں اور وفات 1162ء/561ھ میں ہوئی۔ آپ بحیرۂ کیسپین کے جنوبی علاقے جیلان میں پیدا ہوئے' جوانی کے بعد زیادہ وقت بغداد میں گزارا۔

آپ اگرچہ زمانی اعتبار سے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے پہلے کے ہیں تاہم آپ کا مقام و مرتبہ اور زندگی بھر کی مساعی متکلمین اور اصحاب ظاہر کے درمیان بیچ کی راہ کی ہیں۔ لہٰذا آپ کا تذکرہ امام غزالی رحمہ اللہ اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بعد کیا جا رہا ہے تاکہ گیارہویں صدی عیسوی میں جو فکری دھارے امت مسلمہ کے پیکر میں جاری تھے ان کا SYNTHESIS یا نقطۂ اتصال جس طرح شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی شخصیت کے روپ میں ڈھل کر دنیا کی نگاہوں کے سامنے آیا اس طرح ان کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے۔

آپ کے دور میں ایک طرف عجمی فلسفیانہ نظریات بالخصوص یونانی فلاسفہ کا چرچا عروج پر تھا اور اسلام کی طرف سے صف اوّل میں متکلمین کا گروہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کر رہا تھا اور اسلامی عقائد اور ایمانی کیفیات اور اثرات کے علاوہ اسلامی روایات اور ثقافت کے تحفظ کا بھی ضامن تھا۔ اس جد وجہد میں دوسری انتہاء پر اصحاب ظاہر تھے جن کے طبقہ متقدمین میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تھے اور بعد میں یکے بعد دیگرے کئی اصحاب علم و فضل میدان میں اپنے جوہر دکھاتے رہے۔' اس طبقہ میں آخری اور بلند ترین مقام میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ یا ان کے شاگرد علامہ ابن قیم رحمہ اللہ ہیں۔

اس نظریاتی اور فکری کشاکش کے نیچے میں اگرچہ مسلمانوں کا مجموعی عمل کے اعتبار سے گراف نیچے سے نیچے ہی گرتا رہا تاہم اس کا ایک فائدہ ہوا کہ قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ کے تحفظ کا بندوبست ہو گیا جس سے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ہدایت کے بنیادی ماخذ زمانے کی دستبرد اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ گئے۔

شیخ موصوف علیہ الرحمہ کے زمانے میں اوپر درج خارجی حالات کے علاوہ چند اور باتوں کا ذکر ناگزیر ہے تاکہ اس ماحول کے پس منظر (SCENARIO) میں آپ کے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں نیز امت مسلمہ کی بیداری کے لئے آپ کی کوششوں کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکے۔

اس ضمن میں آگے بڑھنے سے پہلے اس سلسلہ سیمینار کے آغاز پر ہم نے جو چند معروضات پیش کی تھیں ان کا خلاصہ دوبارہ درج کیا جا رہا ہے تاکہ ''گزشتہ سے پیوستہ'' ہو کر معاملہ محکم اور مطلوبہ مقاصد پر رہے جس کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا اور سارے سلسلہ بحث کا ابتدائی سرا ذہن سے محو نہ ہونے پائے۔

یہ 20 شخصیات' صحابہ کرام ﷺ کے بعد اور قیام پاکستان سے پہلے کی ہیں جنہوں نے انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی میں ملت کی بیداری اور اسلام کے احیاء اور غلبے کے لئے کام کیا ہے۔ جہاں تک یک رخی شخصیات کا تعلق ہے تو خانقاہوں کے آباد کرنے والے ہمارے محترم بزرگانِ دین ہوں یا مسلمانوں کی سیاسی باگ دوڑ سنبھالنے والے حکمران بادشاہ' ہوں اگر انہوں نے ایک میدان میں کام کیا ہے اور دوسرے میدان میں کی مساعی کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے تو ہماری اس ساری گفتگو میں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس کا خاکم بدہن یہ مطلب بھی نہیں کہ ان کی مساعی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ 1400 سالہ تاریخ میں سے صرف 20 نامور شخصیات چننا ہی اصل مجبوری ہے ورنہ اسلاف میں کئی پہلوؤں سے بے شک ایسے گوہر موجود ہیں جن کا کوئی ہم پلہ تاریخ عالم میں شاید ہی موجود ہو۔

اس ضمن میں اس بات کا بھی اعادہ کر دینا ضروری ہے کہ ہماری یہ فہرست کوئی حرفِ آخر نہیں ہے اس میں اختلاف بلکہ شدید اختلاف کا حق کسی بھی اہل علم کو حاصل ہے ہم نے تو آغاز

میں بھی اس کا تذکرہ کیا تھا کہ یہ فہرست امت مسلمہ کی فکری اور نظریاتی تسلسل اور اس میں تجدیدی اور تحریکی مساعی کی بازیافت کے پیش نظر ایک طالب علمانہ کوشش ہے تاکہ امت مسلمہ کے فعال عناصر اور ACTIVISTS طبقے میں جذبہ، تحریک اور فعّالیت نہ صرف برقرار رہے بلکہ اسلاف کے کارناموں کے تذکرے سے اور زیادہ مشتعل ہو جائے ــــــــــــ اس پس منظر میں ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے فرمان کا تذکرہ بھی ضروری ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِأَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَادِیْنَھَا

(ابوداؤد عن ابی ھریرۃ)

''اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر سو سال پر ایسے افراد پیدا کرتا رہے گا جو اس کے دین کی تجدید کریں گے۔''

اسلام کے احیاء اور تجدید کے کام کے لئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں سے ہر صدی میں ایسے باہمت اصحاب اٹھاتا ہے اور آئندہ بھی اٹھاتا رہے گا تاآنکہ اسلام کا موعودہ عالمی غلبہ وقوع پذیر ہوجائے۔ وما ذالك على الله بعزيز

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے زمانہ ــــــــــــ گیارہویں اور بارہوں صدی عیسوی کے جن چند خاص تاریخی اور انسانی عوامل کا تذکرہ ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں۔

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں دور نبوی ﷺ سے بُعد کا نتیجہ

یہ بات ہمارے ایمان کا جزو ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات بنیادی طور پر ایک ہی تھیں البتہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کی مساعی چونکہ وقتی تھیں اور اپنے اپنے علاقے اور قوم میں تھیں پھر ابتدا میں وسائل آمدورفت بھی ناپید تھے مزید برآں نبوت و وحی کا سلسلہ جاری تھا اضمحلال اور بے عملی پر اللہ تعالیٰ نیا نبی علیہ السلام مبعوث فرما دیتے تھے اور یوں اسلام کی تعلیمات کا تسلسل قائم رہتا تھا تاآنکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت نبی آخرالزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور ان کو رحمۃ للعالمین بنا دیا۔ اپنے زمانے میں بھی وہ کل روئے ارضی کے لئے نبی تھے اور تاقیام قیامت بنی نوع انسان کی طرف بھی نبی علیہ السلام ہیں۔

آپ کی تعلیمات کئی اعتبار سے منفرد ہیں اور آپ کا دور مبارک نوع انسانی کے بلوغ کا زمانہ اور دور جدید کا افتتاحی دور ہے۔ لہٰذا آپ کی تعلیمات کی وسعت بھی زیادہ ہے اور زمانی تسلسل بھی ہے، آپ ﷺ کی (اور تمام انبیاء علیہم السلام کی) تعلیمات کا خلاصہ چند جملوں میں بیان کیا جائے جس میں آپ کی ذاتی زندگی کی درخشاں مثالیں، غار حرا سے ہجرت تک کے مراحل، ہجرت سے میثاق مدینہ، بدر و اُحد، خندق کے معرکے ــــــــــ صلح حدیبیہ، خیبر اور فتح مکہ کی کامرانیاں ــــــــــ پھر حنین، موتہ اور تبوک کے مراحل ــــــــــ نیز اسلام کی تعلیمات کا عملی نمونہ اور ــــــــــ نفاذِ حدود اللہ کا مرحلہ سب کی سب اس میں سما جائیں ــــــــــ وہ یہ ہے کہ!

☆ آپ ﷺ نے تاریخ انسانی کی عمومی سوچ یعنی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے فرق کو مٹا کر زندگی کے تمام شعبوں کو ایک وحدت قرار دے دیا اور اس مجموعے کو اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت و تعلیمات یا قرآن و سنت کے تابع کر دیا کہ زندگی کا کوئی گوشہ (WALK OF LIFE) اس سے مستثنیٰ نہ رہا۔ یہ آپ ﷺ کی انقلابی شان تھی اور ختم نبوت کے نتیجے میں انفرادیت ــــــــــ اور منفرد ہونے کے تقاضوں کا عملی نمونہ تھا' تاریخ میں اجتماعی سطح پر اور وسیع پیمانے پر یہ کام پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ اس جد جہد اور جہاد کے نتیجے میں سیرت و کردار کے لحاظ سے اہل ایمان (صحابہ کرام ﷺ) میں سے ایسی شخصیات اٹھیں کہ تاریخ انسانی میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے اور بعض واقعات ایسے ہیں کہ صحابہ کرام ﷺ انسان نہیں کوئی SUPER MAN مخلوق لگتے ہیں اور "مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْم" (یہ انسان نہیں ہے یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے) والا معاملہ محسوس ہوتا ہے۔

☆ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کی تربیت کر کے ایسی کندن شخصیات تیار کیں تھیں جو جامع الصفات اور کامل شخصیات تھیں جس کا تذکرہ سورۃ فتح کے آخری رکوع میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو "رات کا راہب" اور "دن کا مجاہد" بنا دیا تھا۔

اس بات کو UNBELEIVABLE سمجھ کر ایرانیوں کے سپہ سالار نے اعتراف کیا تھا کہ یہ عام انسان نہیں ہیں۔ دنیا نے پہلے راہب بھی دیکھے تھے اور فوجی بھی۔ مگر وہ راہب بھی

اورفوجی بھی 24 گھنٹے کے راہب اورفوجی ہوتے تھے راہب دن کا بھی راہب ہے اوررات کا بھی راہب'اس کے شب وروز اسی کے گرد گھومتے ہیں۔اور ــــــــــــــ فوجی 24 گھنٹے کے فوجی تھے وہ دن میں فوجی کی ذمہ داریاں ادا کرتے تھے اوررات کو عیاشی کرتے تھے اورشراب اور بدکاری کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔

ہمارے پیغمبر ﷺ کا کارنامہ یہ تھا اورانقلابی شان اورانقلابی تربیت یہ تھی کہ آپ نے جو''اصحاب'' اوراہل ایمان دنیاکے سامنے پیش کیے وہ''رات کے راہب'' اور''دن کے مجاہد'' تھے۔ایک ہی انسان ہے وہ رات کو مصلّی پر کھڑا رورہا ہے سجدہ ریز ہے اوروہی شخص دن کوتلوار سنبھال کرگھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا جہاد کررہا ہے۔

یہ منظر دنیانے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا؛ اسی لیے ایرانی فوج کیا ساری غیرمسلم دنیا پریشان تھی کہ ان کا مقابلہ مشکل ہے اوراس کی گواہی ایرانی سپہ سالار رستم نے یہ کہہ کردی تھی کہ "ھم رھبان باللیل وفرسان بالنھار" (وہ رات کے راہب اوردن کے شاہسوار ہیں) یا ــــــ ع ''درکف جام شریعت درکفے سندان عشق'' ایک ہاتھ میں قرآن اورایک ہاتھ میں تلوار کی حامل شخصیات تھیں جوحضرت محمد ﷺ نے تیار کی تھیں۔تاہم حالات کے دباؤ اور قانونِ خداوندی اورفطرت انسانی کے عوامل کے تحت وہی کچھ ہوا ــــــــــــــ جسے رسول اللہ ﷺ نے خودفرمایا تھا:

خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِىْ ـــــ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ـــــ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ

یعنی میرے دورنبوت سے بُعد کی وجہ سے ہرآنے والی نسل پہلی نسل سے علم وعمل میں نیچے ہوگی۔

چنانچہ ــــــــــــــ ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے صرف ایک سوسال بعد یعنی تین نسلوں کے گزرنے پرمسلمانوں میں سیرت وکردار اورعلم وعمل کے لحاظ سے زوال آتا چلا گیا۔

پہلی تقسیم یہ ہوئی کہ خلافت وراثت کے طور پر باپ سے بیٹے کو منتقل ہونا شروع ہوئی اوردین سے دوری کے باعث حکمران سیاسی اعتبار سے منہ زوراورناقابل اصلاح ہوتے چلے گئے علمائے حق حکمرانوں کووعظ ونصیحت کرتے تھے اورتوجہ دلاتے تھے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے تھے

لہٰذا سیاسی حکمرانوں، بادشاہوں یا نام نہاد خلفاء کا طبقہ وجود میں آ گیا جو ہر طرح کی بے راہ روی، لوٹ مار جائز و ناجائز دولت کمانے کو وطیرہ بنا لیتے تھے۔ دوسری طرف اہل حق اور علماء حق تھے جو دین پر اپنی حد تک عمل کرتے تھے مگر اس کے نفاذ کی قوت سے محروم تھے وہ قوتِ نافذہ حکمرانوں کے پاس تھی جو اپنی عیاشی کے لئے اسلامی قوانین کا کلی نفاذ اپنے لیے موت سمجھتے تھے۔

☆ پھر اس طبقۂ علماء حق میں دو طرح کے لوگ نمایاں ہو گئے ــــــــــــ ایک وہ جو علم کے پڑھنے پڑھانے میں نمایاں تھے اور دوسرے جو علم کے حصول کے ساتھ باطنی ایمانی کیفیات، نیت کی درستی، اصلاح باطن اور خلوص و اخلاص کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ یہ علماء اور صوفیاء کے دو علیحدہ رنگ کے لوگ معاشرے میں جگہ بنا کر عوام کی نگاہوں میں آ چکے تھے۔ ان تینوں طبقات میں عام انسانی کمزوریوں کی بنیاد پر مخلص بھی تھے حق کے علمبردار بھی تھے اور دنیا پرست اور موقع پرست بھی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ انہیں حکمرانوں میں سے اٹھے اور خلیفہ راشد اور عمر ثانیؒ کہلائے تاہم دور نبوت سے بُعد کی بنا پر ان تینوں طبقات میں اہل حق کم سے کم اور دنیا پرستوں کی نسبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمہ اللہ دوسری صدی کے بزرگ ہیں صاحب علم بھی ہیں صاحب سیف بھی ہیں ان کا مشہور شعر اپنے دور کے حالات کا مرثیہ ہے۔ ؎

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ
وَاَحْبَارُ سَوْءٍ وَ رُهْبَانُهَا

''بادشاہوں، علماء سوء اور راہبوں کے سوا' دین میں فساد اور کسی نے پیدا نہیں کیا''

گویا ــــــــــــ حکمرانوں میں غاصب ظالم دنیا پرست حاکم' علماء میں موقع پرست فتویٰ فروش سرکاری درباری علماء کا طبقہ اور صوفیاء میں نام نہاد صوفی اور لوگوں سے نذرانے وصول کرنے والے لوگ ــــــــــــ بھی عام ہو رہے تھے۔ یہ حالات خلافت راشدہ (11ھ۔40ھ) کے صرف ایک صدی بعد (140ھ) دور بنوامیہ کا اختتام اور دور بنوعباس کے آغاز کی چند دہائیوں میں واضح اور نمایاں ہو چکے تھے۔

☆ عوام کو لوٹنے والے تین طبقات کی تثلیث حضرت محمد ﷺ سے پہلے بھی دنیا میں اپنی

گرفت مضبوط رکھتی تھی اور آپ ﷺ کے بعد میں غیر مسلم تو کیا خود مسلمانوں میں یہ طبقات عوام کو لوٹنے میں مشغول رہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے (ماسوائے چند تاریخی استثناءات کے جو شاذ کے حکم میں ہیں)۔

اس دوسری صدی میں اصلاحی کاموں کے لیے اہل حق علماء وصوفیاء نے کام شروع کیا ہے اور اسلام پر ہر چہار طرف سے اپنوں اور غیروں کی ہر یلغار کو اپنے سینوں پر روکا ہے اور جانوں پر کھیل کر اور ہر مصیبت اور آزمائش برداشت کر کے اسلام کا جھنڈا سربلند رکھا ہے۔ 20 نامور شخصیات میں جن حضرات کے نام نمایاں ہیں وہ ایسے ہی باہمت و باکردار افراد تھے جنہوں نے انفرادی واجتماعی سطح پر امت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنا سب کچھ قربان کر کے امت محمد علی صاحبہا کو نقصان سے بچایا اور وراثت انبیاء علیہم السلام کی اہلیت کا حق ادا کر دیا۔

دوسری اہم بات جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے دور میں نمایاں ہو چکی تھی کہ اسلام کا دفاع کرنے والے دو طبقات ــــــــــــ متکلمین اور اصحاب ظاہر جو دونوں گروہ اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام کا دفاع کر رہے تھے اور اسلام کی جنگ لڑ رہے تھے' اس موقع پر دشمنان اسلام نے بڑی چابک دستی سے ان دو گروہوں کو آپس میں لڑا دیا تھا تا کہ اصل دشمن درمیان سے صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے اور ثانیاً اسلام کی قوت کو آپس کی خانہ جنگی اور فرقہ واریت کی نذر کر کے مسلمانوں کو داخلی طور پر کمزور کر دیا جائے۔

افسوس کہ دور بنو عباس کے آغاز سے ہی ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ دشمن اپنے تمام مقاصد میں آہستہ آہستہ کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کا رعب داب، کروفرّ اور حکومت ولشکر موجود تھے مگر وہ جذبہ اور شان آہستہ آہستہ ایمان کی کمزوری، دنیا پرستی اور حب جاہ کی وجہ سے ختم ہو رہی تھی۔

اس پس منظر میں جن اصحاب علم ودانش اور فہم وبصیرت نے دشمن کی چال کو سمجھ کر مسلمانوں کی داخلی لڑائی اور خانہ جنگی کو روکنے کی کوشش کی ہے وہ بہت عزت احترام کے حقدار ہیں

ع اُو گرامی تر است کُو داناست

تیسری اہم بات یہ ہے کہ سیاسی طور پر بنوعباس کی حکومت بہت کمزور ہو چکی تھی اور حکمران طبقہ عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں پڑ چکا تھا، 300 سالہ اقتدار کی بنیادیں کمزور پڑ گئی تھیں، ترکستان، شمالی ایران وغیرہ کے علاقوں میں عباسی اقتدار کمزور اور سلجوقیوں کی حکومتیں مضبوط ہو گئیں تھی؛ دمشق، مصر، شمالی افریقہ میں بھی مقامی حکمرانوں نے سر اٹھایا تھا اور مرکز بغداد سے علیحدگی اور بغاوت کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ ذیل میں درج چند اہم واقعات اسی دور کی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے دور میں ہوئے اور جن کے اسباب وعواقب ان کی نگاہوں میں تھے:

(i) مصر میں فاطمیوں کا اقتدار جس میں کعبہ کی بے حرمتی اور حجر اسود کو اکھاڑ کر مصر لے جانے کے روح فرسا سانحات بھی شامل ہیں۔

(ii) غیر مسلم اسلام دشمن قوتیں بالخصوص یہود اتنے مؤثر اور اپنی کاروائیوں میں آگے بڑھ گئے تھے کہ ساڑھے چار سو سال پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہونے والے بیت المقدس کی حفاظت عباسی حکمرانوں کے بس میں نہ رہی یہود کی مسلمانوں کے اندر سازشوں سے مسلمانوں کی سیاسی طاقت کمزور ہوئی اور بیرونی سازشوں سے عالم عیسائیت جاگا اور پورا یورپ شہنشاہ روم کی قیادت میں مذہبی جنگ لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور حالات ایسے ہو گئے کہ ان صلیبی جنگوں کے نتیجے میں 1098 کے لگ بھگ بیت المقدس اور یروشلم کا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور عیسائی قبضے میں چلا گیا، عیسائیوں نے مذہبی جنونی کیفیت میں اس علاقے میں قتل عام کیا اور مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے اور قسطنطنیہ سمیت پورے یورپ نے فتح کے شادمانے بجائے۔ اس شکست اور اس کے بعد کے اثرات کو شیخ موصوف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

(iii) دنیا میں خفیہ انجمنیں اور ادارے کام کرتے ہیں بالخصوص اسلام کے غلبے کے اس دور میں جتنی خفیہ سرگرمیاں زیر زمین پروان چڑھیں اس میں بلا شک وشبہ یہود کا ہاتھ تھا؛ بلکہ دنیا میں

ہر خفیہ سوسائٹی میں اسی شیطانی اور ابلیسی گروہ کی کارستانیاں شامل ہوتی ہیں۔

بنوعباس کی حکومت کے اس روبہ زوال عرصے میں ایک طرف بیت المقدس بھی ہاتھوں سے نکل گیا ــــــــــــ دوسری طرف خفیہ سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ ان خفیہ ابلیسی سرگرمیوں کا نقطہ عروج حسن بن صباح نامی شخص کی سرگرمیاں ہیں جس نے اپنے پیروکاروں کو فدائیین کے نام سے منظّم کیا ایک صحت افزاء پہاڑی علاقہ میں خودساختہ جنت بسائی اور مسلمان حکمرانوں اور اہم شخصیات کو قتل کروانے کے لیے اپنے فدائیین کو استعمال کیا اس کی کارروائیوں سے پورا شمالی ایران ان کے زیر اثر رہا اور سلجوقی حکمران خوارزم شاہ سمیت بے شمار زعماء کو جو بھی اس کی مرضی پر چلنے کو تیار نہیں تھا قتل کروادیا۔

ان تخریبی کارروائیوں میں قریب تھا کہ سارا مشرق وسطی صلیبی جنگوں کی نذر ہو جاتا اور صلیبی اقتدار کا حصہ بن جاتا۔ عیسائیوں کا یہ مذہبی جنگی جنون جاری تھا کہ اللہ تعالی نے دمشق میں ''زنگی'' خاندان کو اٹھایا اور نورالدین زنگی اور پھر صلاح الدین ایوبی نے اسلام اور مسلمانوں پر بڑے احسان کیے ذاتی طور پر بھی وہ بہت خداترس، پارسا اور نیک حکمران تھے۔

(iv) حکمران نورالدین زنگیؒ کے دور میں وہ کلیجہ شق کر دینے والی سازش بھی سامنے آئی جس سے سب مسلمانوں کی سانسیں رک گئیں دو یہودی شیطان مسلمانوں کے روپ میں مدینے میں آباد ہو کر بظاہر عبادت گزاری اور پارسائی کی آڑ میں سرنگ کے ذریعے مسجد نبوی حضرت محمد ﷺ کے جسد مبارک تک رسائی کی کوشش کر رہے تھے اور جسد مبارک کو نکال کر غائب کرنا چاہتے تھے جس کے خوفناک نتائج کا اہل علم ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نورالدین زنگی کو بروقت خبردار کیا اور اس نے اس سازش کو پکڑا اور 'یہودی شیطانوں' کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ ایسے ناپاک کام یہودی اپنی ایجنسیوں کے ذریعے ہی کرواتے ہیں مگر ان کو شک گزرا کہ کوئی نام نہاد مسلمان اس غلیظ اور گھناؤنی حرکت میں شامل کریں گے تو شاید کہیں اس سازش کا راز ہی فاش نہ ہو جائے۔

ان سیاسی حالات میں اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے ماحول میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے جو کام کیا اور مسلمانوں کو حوصلہ دے کر منظّم کیا' وہ انہیں کا کام تھا انہوں نے ایک مشنری جذبے

کے ساتھ کام کیا اور امت مسلمہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو مشکلات اور خطرات کے بھنور سے نکالنے کی کوشش کی۔ شیخ موصوف 18 سال کی عمر میں بغداد آئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے بیرونی سفر بہت کم کیے اور وہ مشنری اسفار بھی حج وغیرہ کی طرح کے مذہبی اسفار تھے۔ ایک تذکرہ کے مطابق شیخ موصوف 1128ء میں ملتان بھی تشریف لائے تھے اور یہاں چند ماہ قیام فرمایا۔

شیخ موصوف نے وعظ و نصیحت اور اصلاحی تقاریر کے ذریعے لوگوں میں دین کے احیاء کا جذبہ بیدار کیا ان کا وعظ پر مغز، مؤثر اور دلنشیں ہوتا تھا اور ایک ایک وقت میں ہزاروں لوگ ان کی خانقاہ میں آ کر ان کے وعظ سے مستفیض ہوتے تھے ان کے وعظ سے جو حضرات متاثر ہو گئے تھے شیخ موصوف نے ان سے کام لینے کے لئے انہیں منظّم فرمایا اور ان کی اپنے اصلاحی اور مشنری خیالات پر تربیت کی، ان کی درجہ بندی فرمائی اس طرح ان کے ہزاروں کی تعداد میں تربیت یافتہ شاگرد یا درویش یا ''اسلامی کامریڈ'' تیار ہوئے۔ شیخ موصوف ان تربیت یافتہ شاگردوں کی جماعت میں سے صلاحیت اور حالات کے مطابق مختلف جگہوں پر اپنے نمائندے بھیجتے تھے جو وہاں کے حالات کے مطابق کام کرتے تھے اور حالات کی نگرانی کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ان کا اپنے شاگردوں کے درمیان رابطہ تھا اور پیغام رسانی کا سلسلہ بھی۔ حیرت ہے کہ اس زمانے میں ایک شخص اتنا بیدار مغز اور حالات پر نظر رکھنے والا تھا کہ ہر چہار طرف انہوں نے اپنی اصلاحی کوششوں کے محاذ قائم کر دیئے۔ سندھ، پنجاب، اجمیر، ملتان، افغانستان، ایران، عراق، مشرق وسطی، عرب، شمالی افریقہ حتیٰ کی یورپ کے مغربی حصے اندلس (جسے سپین یا ہسپانیہ بھی کہا جاتا ہے مسلمانوں کے دور میں اسے اندلس کہا جاتا تھا 1492ء میں یورپ نے زبردستی مسلمانوں کو ختم کر کے مسلم حکومت ختم کی تو اس علاقے کا نام بدل کر ہسپانیہ رکھ دیا جو بعد میں بگڑ کر اب صرف سپین رہ گیا ہے یہ اس لئے کیا کہ تاریخ میں اندلس میں مسلم اقتدار کی تفصیلات پڑھ کر انہیں فوراً سمجھ میں نہ آ سکے کہ کس علاقے کی بات ہو رہی ہے اور یورپ میں مسلم اقتدار کے تذکرے مسلمانوں کے ذہن سے محو ہو جائیں حالانکہ یورپ پر علمی، ثقافتی، تمدنی، تحقیقی، ادبی میدانوں میں عربوں کے اتنے احسانات ہیں کہ یورپ کبھی ان کا احساس بھلا نہیں سکتا تا آنکہ وہ احساس فراموشی اختیار نہ کر لے) تک کے دربار میں ان کی رسائی تھی اور ان کے شاگرد وہاں بھی

مؤثر انداز میں عمائدین سلطنت اورعوام میں برابر کام کر رہے تھے۔اس ساری عملی جد وجہد اور شاگردوں کی روحانی، اخلاقی اور سیاسی و معاشرتی تربیت کے نظام کوانہوں نے ''سلسلۂ قادریہ'' کے نام سے منظّم فرمایا اوراس کے ذریعے اپنے شاگردوں میں وہ آگ بھردی کہ ان کے دور میں بھی اوراس کے بعد کئی صدیوں تک ان کے اثرات مشرق ومغرب میں بچشم سر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ان کے سلسلہ قادریہ کے کام میں قرآن وسنت یا قرآن وحدیث کی بڑی اہمیت تھی وہ مسلمانوں کے خارجی سیاسی حالات،حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ، یہود کی ریشہ دوانیاں،فلاسفہ کی فکری کمزوریاں اورمنطق کی قوت استدلال کے بودے پن کوخوب سمجھتے تھےاوراس ''نوربصیرت'' کو اپنے شاگردوں درویشوں اورخلفاء میں بھی عام کررہے تھے۔

ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سابقہ تین صدیوں میں یونانی فلسفہ کی یلغار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے علمی معرکوں کی دلدل سے لوگوں کونکالا ہےاورروحانی تعلیمات کے ذریعے تصوف اور احسان کی طرف لے کر آئے ہیں۔''متکلمین'' اور''اصحاب ظاہر'' میں فکری اتحاد و اتصال(SYNTHESIS) کی کوششیں کی ہیں اوراپنی عملی زندگی میں اس سوچ اورطرز عمل کو کامیاب کر دکھایا ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے وقت اور صدی کے مجدد تھے جنہوں نے دینی فکراورانقلابی فکرکوازسرنوتازہ کردیا۔

ان کی حد درجہ محنت اوران کے شاگردوں کی جانثاری اورفدائیت کا یہ مظہر ہے کہ ہم مشرق ومغرب پورے عالم اسلام میں ان کے شاگردوں اورزیراثر لوگوں کو بڑے بڑے کام اور کارنامے سرانجام دیتے دیکھتے ہیں۔ان کے اس عالمی سطح کے نظام میں مختلف جگہوں پر اپنے خلفاء وغیرہ کا ایک نظام قائم تھا جنہیں انہوں نے اپنے اصلاحی فکر کی بنیاد پراور تنظیم کی غرض سے مختلف روحانی نام دے رکھے تھے جس سے درجہ بندی اور CADRES معین ہوتے تھے۔غوث، قطب، ابدال سب اسی دور کی اصطلاحات ہیں۔اور یہ آج کل امیر، امیر حلقہ،معتمد،مرشد عام کی طرح کی ہیں۔ان کا ملتان تک خودتشریف لانا اس ساری جد وجہد کی تنظیمی اورتربیتی شکل ہے۔ان کے شاگردشمالی افریقہ اوراندلس (سپین) تک میں بڑے موثر تھےاورمنظّم انداز میں کام کرتے تھے جس کے اثرات شیخ ابن عربی رحمہ اللہ اور دوسرے اکابر صوفیاء کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

آپ نے اپنی مساعی اور تجدیدی کوششوں کے لئے تصوف کا میدان چنا اور اسی میں اس قدر منہمک ہوئے کہ یہ ان کی پہچان بن گیا آپ مذہباً حنبلی تھے اور حنبلی فقہ کے ائمہ میں شامل تھے۔ تاہم یہ پہلو آپ کی اصلاحی سرگرمیوں میں دب گیا۔ آج کے ماحول میں آپ کی صوفیانہ خدمات کا تذکرہ عام ہے اور اس میدان میں حنفی بریلوی مسلمان پیش پیش ہیں آج اگرچہ ہمارے ہاں فرقہ بندی بلکہ فرقہ پرستی ہے مگر ہمارے اسلاف میں ان چیزوں کی شدت نہیں تھی ہمارے اسلاف حنفی، شافعی، مالکی، مذاہب کو فقہ کا ایک میدان سمجھتے تھے اور کسی کا حنفی یا حنبلی ہونا مسلمان ہونے پر فرق نہیں ڈالتا تھا اگرچہ آج یہاں حنفی ہونا مسلمان ہونے کے تقریباً ہم معنی ہے اور عوام کو اگر معلوم ہو جائے کہ ہمارے پیرانِ پیر حنبلی مسلک کے تھے اور رفع یدین کرتے تھے تو حیرانی ضرور ہوگی۔ شیخ موصوف رحمہ اللہ کی حنبلی مسلک اور فقہی وراثت آج سعودی عرب اور امارات کے پاس ہے۔ اور ان کی سلسلۂ قادریہ کی وراثت بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کی عوام کے پاس ہے۔

شیخ موصوف کی تجدیدی اور اصلاحی کوششوں کے ضمن میں آپ کی سلسلہ قادریہ کے فروغ کے لیے ان تھک محنت کا نتیجہ ہے کہ آپ صوفی زیادہ اور حنبلی کم پہچانے جاتے ہیں یہ آپ کی امت کے لئے اصلاحی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

آپ نے اپنے شاگردوں اور پیروکاروں اور طالبین کے لئے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں غنیۃ الطالبین اور فتوح الغیب بہت مشہور ہیں ان کا قصیدہ غوثیہ بھی مشہور ہے جس کا ایک شعر ہدیہ قارئین ہے جس سے ان کی عالمی سطح پر بلادِ شرق وغرب میں سرگرمیوں کے انہماک اور ان کی نگرانی کا غماز ہے۔

نَظَرْتُ اِلٰی بِلَادِ اللّٰہِ جَمْعاً

کَخَرْدَلَۃٍ کحکم اتصال

(میں نے اللہ کی ساری سرزمین کے شہروں پر نظر کی جیسے ہتھیلی پر رائی کا دانہ ہوتا ہے)

اس شعر میں معنویت کا ایک سمندر ہے کہ جیسے آج کل کوئی عالمی سطح کا رہنما دنیا کے نقشے پر مختلف ممالک کی سرگرمیوں کے جائزہ کے لئے غور وفکر کر رہا ہے اور ان کے سرکردہ جانثار ساتھ شریک ہیں جسے آج کل دینی جماعتوں میں ''مرکزی شوریٰ'' کا نام دیا جاتا ہے۔

آپ کے خلوص و اخلاص، بے حد محنت، شب و روز کے مجاہدے اور ہزاروں شاگردوں، مریدوں کی فدائی تربیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ عوام میں لاکھوں کروڑوں عقیدت مندان کا نام آج بھی عزت سے لیتے ہیں اور اہل علم کے نزدیک ان کے کارنامے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے جاتے ہیں۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہ سیمینار 3 ستمبر 06ء بروز اتوار صبح 9:30 تا 12 بجے منعقد ہوا تھا، مقررین حضرات میں پروفیسر مہر غلام سرور صاحب، ساجد محمود مسلم صاحب، مولانا انور چیمہ صاحب اور انجینئر مختار فاروقی صاحب شامل تھے۔ حاضری معمول سے زیادہ تھی اور سیمینار ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

ذاتی حالات وکوائف

نام: سید عبدالقادر، والد کا نام: سید ابوصالح عبداللہ (موسیٰ) بن جنگی دوست، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ بحیرۂ کیسپین کے جنوبی علاقے میں واقع عراق کے ایک صوبے جیلان یا گیلان میں 470ھ /1077ء کو پیدا ہوئے۔ اور وفات ربیع الثانی 561ھ /اپریل 1162ء کو بغداد میں ہوئی۔

آپ تین برس کی عمر میں والدین کے ساتھ بغداد آئے، وہاں دس سال رہے اور پھر والدین کے ہمراہ واپس آبائی علاقہ میں آ گئے، اس کے بعد دوبارہ اٹھارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے بغداد تشریف لے گئے اور اس وقت سے لے کر وفات تک یہی شہر آپ کی سرگرمیوں کی جولانگاہ بنا رہا۔

دوسرے بہت سے اساتذہ کے علاوہ آپ نے علوم وفنون اور ادب کی تعلیم میں سے، فقہ حنبلی کی تعلیم ابوالوفاء بن العقیل اور ابوسعد مبارک مخرمی سے اور حدیث کی تعلیم ''مصارع العشاق'' کے مصنف ابومحمد جعفر سراج سے حاصل کی۔ اور تصوف سے ابوالخیر حماد الدباس نے آپ کو روشناس کرایا جو اپنے وقت کے نہایت محترم و مسلم صوفی اور بزرگ تھے، ان کی سخت ریاضت کا ذکر جو یہ اپنی زیر تربیت مریدوں سے کرایا کرتے تھے، ابن اثیر نے بھی کیا ہے۔

521ھ یعنی پچاس سال کی عمر میں آپ نے وعظ و نصیحت کا آغاز کیا، آپ کے وعظ و

درس کا چرچا دور دور تک پھیل گیا، اس کے کچھ عرصہ بعد آپ کے استاد مخرمی کے مدرسے کا انتظام آپ کے حوالے کر دیا گیا، یہاں آپ کے اہم مشاغل افتاء، درس قرآن وحدیث اور بالخصوص وعظ تھے جن کی شہرت دور دور تک تھی جو دنیائے اسلام سے بے شمار شاگردوں کو کھینچ لائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے دلنشین حسن وعظ کے باعث بہت سے غیر مسلم بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

شیخ نے ایسے دور میں زندگی بسر کی جب تصوف کا عروج اور صوفیاء کے مسلک میں وسعت پیدا ہو رہی تھی اور تاریخی حالات نے ایک سوال اٹھا رکھا تھا کہ زہد وتصوف کے عناصر کو شریعت کے ساتھ ہم آہنگ کس طرح کیا جائے۔ بعض اہل علم نے تو تصوف کی ضرورت وافادیت سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان حالات میں شیخ موصوف نے عملی سرگرمیاں شروع کیں اور وعظ و نصیحت کے ساتھ تصنیف کا کام بھی کیا۔ ''غنیۃ الطالبین'' ان کی طرف منسوب مشہور اور ضخیم کتاب ہے جس میں شریعت وطریقت کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مختلف فرقوں کے درمیان جو اختلافی مسائل ہیں ان کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے، آپ کے مقالات پر مشتمل کتاب ''فتوح الغیب'' تصوف اور معرفت کی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ فتح رحمانی اور فیض ربانی شیخ کے تریسٹھ خطبات کا مجموعہ ہے جو ان کے نواسے شیخ عفیف الدین مبارک نے ترتیب دیئے۔

آپ اخلاق میں اپنے تمام معاصر اولیاء سے ممتاز تھے۔ تذکرہ مشائخ اولیاء میں درج ہے کہ سیرت کردار کے لحاظ سے کوئی ولی آپ کا ہم پلہ نہ تھا۔ آپ دنیوی ضروریات سے بے نیاز تھے، اور بے خوفی سے کلمۂ حق کہتے تھے، حق گوئی، ایثار وسخاوت، عفو ودرگزر کا پیکر تھے، کسی پر ظلم برداشت نہ کرتے غریبوں اور مظلوموں کی امداد کے لیے فوراً تیار ہو جاتے اور شریعت کے معاملے کبھی نرمی نہیں برتتے تھے۔

آپ کا مقبرہ بغداد میں ہے اور پوری دنیا کے مقابرِ اولیاء سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے ہر سال ہزاروں افراد وہاں حاضری کے لیے جاتے ہیں۔